علامہ اقبال کی اساسِ فکر

پروفیسر سید فضلِ امام

''علامہ اقبالؔ کی اساسِ فکر''

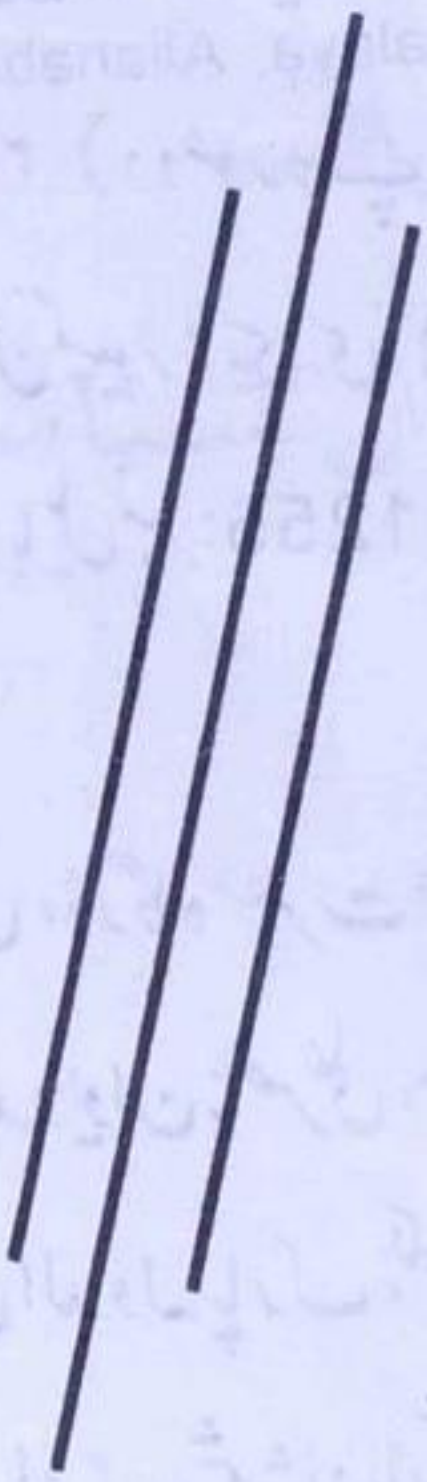

پروفیسر سید فضل امام

ISBN:81-7779-159-1

■ طبع اول 2006 ۲۰۰۶ء

■ تعداد شاعت : ۵۰۰

■ ناشر : ساہتہ بھنڈار، ۵۰/چاہ چند، الہ آباد
Sahitya Bhandar, 50 Chah Chand, Allahabad

■ مطبع : سلیکھ مُدرزآلیہ، الہ آباد
Sulekh Mudranalaya, Allahabad

■ قیمت : ۲۰۰ (دوسو روپے) Price: Rs. 200/-

■ کمپیوٹر کمپوزنگ حسن کمپیوٹرز، سی.سی. 12 سلیمان مارکیٹ، الہ آباد
موبایل نمبر: 9514361255

■ تقسیم کار: :

(۱) عباس بُک ایجنسی، درگاہ حضرت عباس، رستم نگر، لکھنؤ

(۲) مکتبہ اصلاح، مسجد دیوان ناصر علی، مرتضیٰ حسین روڈ، یحییٰ گنج، لکھنؤ

(۳) دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

(۴) ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکٹ، علی گڑھ

(۵) اقبال بک سینٹر، مفتی گنج چوراہا، لکھنؤ

(۶) جعفریہ کالونی امامیہ لائبریری ۴۵۱/۲۶/۳ امامیہ مارگ، مفتی گنج، لکھنؤ، اتر پردیش (ہندوستان)

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

انتساب

اعلا ظرف

اقبال شناسوں

کے نام

فہرست مضامین

	صفحہ
☆ چند باتیں	۵
۱۔ اقبالؔ کا مردِ مومن	۷
۲۔ اقبالؔ کا مسلک	۲۸
۳۔ اقبالؔ اور عشقِ اہلِ بیتِ رسولؐ	۶۷
۴۔ غمِ شہیدِ کربلا دُرِ مقصودِ اقبالؔ	۱۱۶
۵۔ اقبالؔ اور جمہوریت	۱۲۷

چند باتیں

علامہ اقبالؔ پر تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے بے شمار کام ہوئے ہیں اور انشا اللہ ہوتے رہیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ اقبالؔ کی مقناطیسی شخصیت اور ادبی کارنامے ہمیشہ دلچسپی اور خصوصی توجہ کا سبب رہے ہیں۔ کلام اقبالؔ کی مقبولیت اور عظمت اس قدر ہے کہ ادبی، علمی، تہذیبی، تمدنی، ثقافتی، سیاسی اور مذہبی مضامین اور تقاریر میں ان کے اشعار بطور مثال آج بھی پیش کیے جاتے ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ مستقبل قریب اور بعید میں بھی پیش کیے جاتے رہیں گے۔ ایشیائی ثقافت کے استحکام کے لیے علامہ موصوف نے جو گراں قدر کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اس کا کوئی بھی صحیح الدماغ منکر نہیں ہو سکتا ہے۔

☆ یہ کتاب میرے مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جو تقریباً ایک ہی نوعیت کے ہیں اور ملک کے مقتدر جرائد ورسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ انھیں کتابی شکل میں اس لئے شایع کیا جارہا ہے تاکہ محفوظ ہوجائیں۔ ان میں اشعار کی تکرار بھی پائی جائے گی جو قند مکرر کا مزا دیں گے۔ اسی لیے میں نے انھیں جوں کا توں رہنے دیا ہے کسی طرح کی ترمیم نہیں کی گئی ہے تاکہ کلام اقبالؔ کی تکرار سے اذہان مستفید اور مستفیض ہوتے رہیں۔ یہاں تک کہ یہ اشعار ازبر ہوجائیں اور ارباب علم ونظر کے حافظے

کا حصہ بن جائیں۔ دراصل اسی میں آج کی اس بے قرار اور مضطرب دنیائے انسانیت اور آدمیت اور عالم اسلام کی بقا کا راز مضمر ہے۔

☆ بعض ناعاقبت اندیش حضرات کلام اقبالؔ کے اس اہم اور گراں قدر سرمایے کو شاعرانہ انداز پر محمول کرنے میں ہی یک گونہ سکون محسوس کرتے ہیں، حالانکہ غیر جانب دار ہوکر کھلے دل و دماغ سے اس کا مطالعہ کیا جائے تو یہ علامہ اقبالؔ کے گہرے شعور و افکار کا نتیجہ قرار پاتے ہیں۔ اس کلام میں اقبالؔ کے تفکر و تفلسف کی صداقت سے لبریز جولانیاں، دعوت فکر و نظر دے رہی ہیں۔ لہٰذا اِن مضامین میں اقبالؔ کے فارسی اور اردو اشعار کے ساتھ ان کے مکاتیب کے بھی معتبر حوالے دیئے گئے ہیں۔ اقبالؔ کے فارسی کلام (اسرار خودی اور رموز بے خودی) کے وہ حصے بھی مع تراجم پیش کیے گئے ہیں جو مکمل اور مستند ہیں اور اہل بیت رسول صلی اللہ وعلیہ سلم کے عشق میں سرشار ہیں۔

یقین ہے کہ میری اس کاوش کو اہل علم و ادب حضرات کے ساتھ اہل دل، اہل ذوق اور اہل فکر و نظر قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

فقط

والسلام

☆ ۱۰ اے. ایبنک روڈ، الہ آباد — فضل امام

اپریل ۲۰۰۶ء

اقبالؔ کا مردِ مومن

اقبالؔ کے ''مردِ مومن'' کا تصور بہت واضح ہے مگر اربابِ علم و دانش اسے کافی بحث طلب بنائے ہوئے ہیں۔ بہت سے ذہنی تحفظات اور تاریخی موشگافیوں کے باعث تاویلات و تدلیسات کا بازار گرم رکھا جاتا رہا ہے۔ کبھی شاہینؔ کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہیں اس کی پرواز کو نمونہ بنایا گیا لیکن بات اس طرح سے نہیں بنتی ہے حالانکہ اس طرح کے بہت سے اشعار کلام اقبالؔ سے تلاش کئے جا سکتے ہیں:

تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

یا

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سُلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

درج بالا قسم کے اشعار سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ اقبالؔ کی تلاش و جستجو انسانوں کی رہبری کے لئے ایک پرندہ کو ہی پیش کر سکی ہے۔ تعجب ہے کہ اقبالؔ کو کوئی انسانی پیکر نہیں نظر آیا۔ کیا تاریخ آدمیت اور انسانیت کسی شاہینؔ کو جنم نہیں دے سکی؟ یہ ابہام کیوں ہے؟ دراصل اقبالؔ کے لاشعور میں

شاہینؔ کے صفات مرتسم ہیں جس کا اعلان اس کی روح ارتقائی طور پر کر رہی ہے اور جس پر شعریت کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔

اقبالؔ ایک ایسے انسانی پیکر کی تلاش میں ہے جو ضروری نہیں کہ صاحب حکم ہو اور سریر و سپاہ اور تاج و نگیں کا مالک ہو..... بلکہ جو صرف قوی پنجہ ہو، تنہا اپنی ذات میں کامل۔ جو بھی ذاتی صفات کے میدان میں اس کا حریف ہو، وہ اسے کبوتر کی طرح دبوچ کر شکست دے سکے۔ وہ ہمہ تن سرگرم عمل اور سرگرم پرواز ہو۔ آشیانے یا ساز و سامان کی حرص و آز سے بے نیاز ہو۔ وہ قصر سلطانی یا سیاست کے مراکز سے وابستہ نہیں ہو۔ اس کے صفات اور اصول پرستی چٹانوں کی طرح اس کی رفیق ہوں۔ اب اقبالؔ کے شاہینؔ کو اس کی بلند ترین شکل میں پیش کیجئے اور پھر اس اعلیٰ و ارفع صفاتی شاہینؔ کا تطابق تاریخ عالم کے صفحات سے کیجئے تو تاریخ ایک منفرد پیکر انسانی کو مثال کے طور پر پیش کرنے میں فخر محسوس کرے گی اور اقبالؔ کو عالم انسانیت کو پیغام دینے کے لئے اسی مثالی انسان کی تلاش ہے۔ اقبالؔ کی نگاہِ تجسّس مختلف انداز سے مختلف مقامات پر جاتی ہے۔ کبھی اُسے یونانیوں کا علم الاصنام صرف ایک تخیّل نظر آتا ہے۔ مصریوں کی تاریخ ادھوری، بے ربط اور یا وہ گوئی معلوم ہوتی ہے۔ روم کے پاس محض جبر و استبداد اور عیّاری دکھائی دیتی ہے اور ایک ایسا شاہین نظر آتا ہے جو کمین گاہون میں بیٹھا ہوا ہے اور ہر بے گناہ بچے

اور جوان کبوتر کو جھپٹ کر اپنا شکار بنالیتا ہے۔ وہ کبوتر کی جان بخشی میں یقین ہی نہیں رکھتا ہے۔ اقبالؔ قدیم نبیوںؑ کے احاطے کی سیر کرتا ہے۔ وہاں اُسے جزوی اور منتشر صفات ملتے ہیں۔ دینِ یحییٰؑ و عیسیٰؑ فقط غار و کوہ اور بزرگی میں راہبی۔ حضرت اسماعیلؑ، آداب فرزندگی کی مثال۔ حضرت یوسفؑ اور حضرت اسحاقؑ کی نامکمل داستانیں ہیں۔ حضرت موسیٰؑ عمران کے عصا کا شکوہ اور ہیبت، ید بیضا روشنی کے لئے اہم ہے۔ اقبالؔ کارِ کلیمیؑ کو ساز و سامان کی گدائی قرار دیتے ہیں:

؎ بغیر عصا کے کلیمیؑ ہے کارِ بے بنیاد

یا؎ ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے

یا؎ خودی میں ڈوب کر ضربِ کلیمؑ پیدا کر

اقبالؔ کی معرفت شناس نظر عصا سے ضربِ کلیمی نہیں پیدا کراتی بلکہ خودی میں ڈوب کر ضربِ کلیم پیدا کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اقبالؔ کلیم اللہ کے معترف ہیں اور ان کی ہیبت و طاقت سے متاثر ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰؑ اپنا مفہوم ادا کرنے کے لئے زورِ عصا سے کام لیتے ہیں اور ان کی زبان لکنت زدہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی تقلید وہی کرسکتا ہے جو پہلے ربِّ ہارون و موسیٰ سے ویسا ہی عصا حاصل کرسکے۔ مگر ہر کس و ناکس یہ عصا نہیں پاسکتا۔ اقبالؔ ایک ایسے باطنی جوہر کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں جس کے ہاتھ میں

جو بھی عصا آ جائے اس میں عصائے کلیمی کے صفات آشکار ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات حضرت موسیٰ اور ان کے عصا سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اقبالؔ کردار و عمل کے اعتبار سے ایک مکمل انسان کی تلاش میں ہیں۔ اس کی نگاہیں ایک دانائے سبل و ختم المرسلین، سرور کائنات پر جا کر ٹھہرتی ہے جو فیضانِ نظر سے خاکِ راہ کو اسرار الوندی عطا کر رہا ہے۔ اقبالؔ اس بارگاہ میں پگھل جاتا ہے لیکن مقامِ نبوت و رسالت اور مقام بشریت کے درمیان حجاب کون اٹھائے؟ طالب و مطلوب حاجب و محجوب کے راز ہائے سربستہ کون کھولے؟ حضرت محمدؐ مصطفیٰؐ کے سانچے میں کون ڈھل سکے؟ بعد ختم الانبیاء کس طرح خدا سے نبوت مانگی جائے؟ نبوت کو عام انسانی ماحول میں کیسے پیش کیا جائے تا کہ عام انسان اس کی تقلید کر سکے۔

اقبالؔ اسے شدت سے محسوس کرتا ہے کہ یہاں پر نبیؐ نہیں بلکہ جادۂ نبیؐ پر گامزن ہونے والے ایک غیر مَلکی کی لیکن انسانِ کامل کی ضرورت ہے۔ نبیؐ کی ذات مانند آفتاب ہے۔ اسے براہ راست دیکھنا اور پرکھنا مناسب نہیں۔ ایک ایسے آئینے کی ضرورت ہے جو کمالات نبوت کو ''ملکات نفس'' کے طور پر جذب کرے جس میں صحیح طور پر دیکھا اور پرکھا جا سکے۔ یاد رہے کہ نبیؐ کے کمالات عطائے خداوندی ہیں لیکن اس کے صحیح اور سچّے مقلد یا متّبع کے کمالات ذاتی ہیں اور اس ذات کو جوہر اور کمال عطا کرنا فیضانِ نگاہِ

نبوتؐ ہے۔ یہ کامل متبع ہی مومن بن سکتا ہے۔ تقلید واتباعِ کامل، یقینِ کامل کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا مومنین کے جزوی اور انفرادی اوصاف اس مکمل مومن میں کلّی طور پر ہونے چاہئیں۔ اسے جملہ اوصاف حمیدہ کا جامع ہونا شرط ہے۔ اگر کمال نبوتؐ نے ایک بھی اس طرح کا نمونہ پیش نہیں کیا تو نبوتؐ کے کمال پر حرف آتا ہے کہ وہ خود جزوی صفات کی حامل تھی، اکمل نہ تھی۔ اس لئے اقبالؔ کمال نبوتؐ کے مقلد تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں:

نہ میں عارف نہ مجدّد نہ محدث نہ فقیہہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوتؐ کا مقام

اور عارف کے مقام کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

دم عارف نسیم صبح دم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسّر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

جب مقام عارف کی تفہیم ہی دشوار ہے تو معرفتِ مقام نبوت تو اور بھی دشوار گزار ہے۔ اس منزل پر اقبالؔ کا تجسس اور بھی بڑھ جاتا ہے اور اس مومن کی تلاش میں سرگردانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس کی واحد صفت ''ایمان بالیقین'' ہے۔ جس میں شک وشبہ کا گزر نہیں۔ جس چیز یا بات کو ایک مرتبہ دیکھ، پرکھ یا سمجھ لیتا ہے اس پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لئے کہ

یقین، مومن کی اعلیٰ صفت ہے۔ اقبالؔ اسی صفت کو اس طرح شعری پیکر میں پیش کرتا ہے:

خدائے لَم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اَے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

یا

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

اسی یقین کی مختلف شکلوں کو اقبالؔ مختلف رنگ روپ میں پیش کرتا ہے لیکن یہ پیش کش شاعر کی کشفی کیفیات واردات کی ترجمانی ہے جس میں بے ربطی پائی جاتی ہے۔ اقبالؔ اسے کبھی ''جذب دروں'' سے موسوم کرتا ہے اور کبھی اسے ''شرر'' کا نام دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اقبالؔ اس صفت کے موسوم کا عرفان حاصل کر لیتا ہے:

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

یا

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یا

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

یا

عالَم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث

یا

مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اقبالؔ کا مردِ مومن اس قدر جانباز ہے کہ بغیر تیغ بھی لڑتا ہے۔ اسے کسی عصا کی ضرورت نہیں۔ شبِ ہجرت، دشمنوں کے محاصرہ میں تلواروں کے سائے میں سوتا ہے مگر کوئی تلوار باندھنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا ہے۔ وہ رحم و کرم اور عفو سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن جب معرکۂ حق و باطل سرگرم ہوتا ہے تو عرصۂ لا فتیٰ کا شہسوار ہوتا ہے۔ فوجوں کے ہجوم میں صفدر ہوتا ہے۔ وہ بندھے ہوئے قیدیوں کو دیکھ کر کبھی سر قلم کرنے کی خواہش کا اظہار نہیں کرتا۔ وہ میدانِ کارزار میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتا ہے۔ وہ کرّار ہوتا ہے۔ حدیثِ رسولِ کائنات ہے ''لا عطین الرّایتہ غداً رُجلاً کرّارً غیز فرّارً یُحب اللّٰہ ورَسُلہ' وَ یُحب اللّٰہ وَرَسُلہ' یُفتح اللّٰہ علی یدیہ''[۱]

۱؎ (طبری جلد دوم صفحہ ۹۲، صحیح بخاری کتاب، المغازی، روضۃ الاحباب، جلد اول صفحہ ۳۸۵)

وہ مجمعِ عام میں سلونی قبل انتفقد و نی کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ عاجز جواب نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ میں زمین کی راہوں کی بہ نسبت آسمان کی راہوں سے زیادہ واقف ہوں۔ اقبالؔ کا مردِ مومن کلیم باتسخیر ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ کلیم بے عصا بھی ہے۔ اس کی تسخیر صرف مملکتوں کی تسخیر نہیں۔ اقبالؔ کا مردِ مومن ہر جہد میں باتسخیر ہے۔ وہ اصولوں کی مملکت میں بھی فاتح ہے۔ سلطنت علم میں بھی سرفہرست ہے۔ اس کے پاس خودی کی تیز دھار بھی ہے۔ وہ خوددار اتنا ہے کہ طائرِ فکر وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اقلیمِ تن کا بھی حکمراں ہے۔ حادثات اس کے تابع ہیں۔ یہاں تک کہ میدانِ جنگ کی گرم بازاری میں موت بھی اس سے ڈر کر بھاگتی ہے۔ وہ عالمِ پست یعنی زمین کی بہ نسبت عالمِ بالا پر زیادہ حکمراں ہے:

جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبرئیلؔ و سرافیلؔ کا صیاد ہے مومن

مومن ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ صاحب لولاک ہو۔ صاحب لولاک وہی ہے جو چاند کے دو ٹکڑے کر سکے، غروب آفتاب کو طلوع آفتاب میں بدل سکے۔ اقبالؔ کے نظریئے سے دیکھا جائے تو کتنے صاحب لولاک نکلیں گے؟ اقبالؔ اپنی وارداتی کیفیت کو جنوں سے تعبیر کرتا ہے۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چُکا میں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

اقبالؔ کا جنون مردِ مومن کے مختلف روپ دکھاتا ہے:

آئینِ جواں مردی، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

تاریخِ کائنات میں کتنے اللہ کے شیر ملتے ہیں؟ واضح رہے کہ اسدؔ اللہ تو ایک ہی نظر آتا ہے اور وہ سوائے مولائے کائنات حضرت علیؑ ابن طالبؑ شاگردِ سرورِ کائنات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کوئی دوسرا نہیں۔

اقبالؔ کے یہاں مومن کے جزوی صفات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لیکن جزوی صفات صرف جزوی مومن کے یہاں ہوتی ہیں۔ جلد ہی اقبالؔ کا نظریۂ ارتقا اپنے وارداتی تسلسل کے اعتبار سے ایک منفرد شخصیت کو واضح کر دیتا ہے۔ اسمِ علی مرتضیٰؑ اقبالؔ کو تسخیر کی ضمانت نظر آتا ہے:

چوں علیؑ درساز بانانِ شعیر
گردن مرحب شکن خیبر بگیر

بے شک صرف نانِ شعیر پر بسر کر لینا قید عناصر سے کسی حد تک فرار ہے..... مگر فقط یہ فرار یہ قناعت یا کسبِ حلال کوئی شئے نہیں..... اس سے کمزور دل راہب تو پیدا ہو سکتے ہیں، غیرتِ رُستم و نریمانؔ نہیں۔ نان شعیر

پر بسر کرنے والوں کی تعداد لاکھوں ہے لیکن کیا کوئی اسدِ کردگرار، مادر گیتی نے کبھی بھی اس طرح جنم دیا ہے۔ اقبالؔ پکار اٹھتا ہے:

ہزار خیبر و صد گونہ اثر دراست ایں جا
نہ ہر کہ نانِ جویں خورد حیدریؓ داند

نانِ جویں سے قوتِ حیدریؓ فراہم کرنے کے لئے کسی خاص جوہر کی ضرورت ہے اور یہی شرطِ تسخیر ہے:

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدریؓ

مگر اس شرر کی تلاش کے لئے کسی وسیلے کی ضرورت ہے۔

اقبالؔ اپنی تمام تر خرد صرف کر دیتا ہے۔ خرد ٹھوکر پہ ٹھوکر کھاتی ہے لیکن اس راز کو حل نہیں کر پاتی۔ نتیجتاً اقبالؔ خرد کو خود سے سلام کرتا ہے اور اس طرح نغمہ سرا ہوتا ہے:

میرے لئے ہے فقط زورِ حیدریؓ کافی
ترے نصیب فلاطون کی تیزیِ ادراک

اقبالؔ گہری بصیرت اور اُمید کے ساتھ اس شرر یا قوتِ حیدریؓ کا مطالعہ کرتا ہے۔ تب اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ یہ ایک ازلی قوت ہے۔ اس کو فنا نہیں، یہ ہر زمان و مکان میں مصروف ہے۔ یہ اتنی گراں قدر اور بیش بہا ہے

کہ دُنیوی سطوت و سلطنت اس کے مقابلے خس و خاشاک سے بھی کم درجہ رکھتی ہیں:

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسدُاللہی

یا

امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدریؑ تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؑ

یا

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا، زورِ حیدرؑ، فقر بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

خُدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدریؑ و کرّاری

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسداللّٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری

کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی مولا علیؑ خیبر شکنِ عشق

جو کام عصائے حضرت موسیٰؑ کرتا ہے وہی کچھ اقبالؔ کو پنجۂ حیدرؑ میں نظر آتا ہے۔ لیکن پنجۂ حیدریؑ جوہر دار ہے۔

در کفِ موسیٰؑ ہمیں شمشیر بود
کار اُوبالا تر از تدبیر بود

سینۂ دریائے اَحمر چاک کرد
قُلزمے راخشک مثلِ خاک کرد

پنجۂ حیدرؑ کہ خیبر گیر بود
قوّت ازاو ہمیں شمشیر بود

اقبالؔ تسخیر کے راز کو پا رہا ہے۔ یہ ہمہ گیر قوت ہر جگہ مصروفِ کار ہے۔ خیبر و نیل کی تخصیص نہیں جس انسان میں بھی قوت ہے وہ ایک خاص مرتبہ و مقام کا مالک ہے۔ وہ کائنات کے جس حصّے پر بھی ضرب لگائے اس کی ضرب کاری ہوگی۔

پیشِ او نہ آسماں نہ خیبر است
ضربت از اُو مقامِ حیدرؓ است

آفتا بش را زوالے نیست نیست
منکر اُو راکمالے نیست نیست

رحمتِ حق صحبت، اصرار اُو
قہرِ یزداں ضربتِ کرّار اُو

اقبال اسی قوت کو ایک اور نام سے موسوم کرتا ہے۔ وہ اسے عشق بھی کہہ کر پکارتا ہے:

عشق بانانِ جویں خیبر کُشاد
عشق دراندامِ مہ چاکے نہاد

اقبال کی آرزوئیں مچلنے لگتی ہیں۔ وہ قوتِ حیدری یا عشق کا طالب نظر آنے لگتا ہے اور خدائے لَم یَزل کے حضور دستِ دعا بلند کرتا ہے:

جسے نانِ جویں بخشی ہے تونے
اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

کبھی اس طرح کہتا ہے۔

بدہ اُورا جوان پاکبازے
سرورِ شے از شراب خانہ سازے
قوی بازوئے اُو مانندِ حیدرؓ
دلِ اُو از دو گیتی بے نیازے

اور کبھی اس طرح ؎

کور رابینندہ از دیدار کن
بو لہب را حیدرؓ کرّار کن

اس کے بعد جلد ہی اقبالؔ کی تمام آرزوئیں پائمال ہو جاتی ہیں اور بصیرت کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے وارداتِ قلبیہ اور بھی نکھر آتے ہیں۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ عشق یا قوتِ حیدرؓ اتنی عام شے نہیں کہ ہر کس و ناکس کو عطا ہو جائے۔ اس کے لئے تو بڑے بڑے ترستے رہتے ہیں ؎

بے جرأت رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق ید اللّٰہی

اقبالؔ اب تخصیص کر رہا ہے ؎

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

مگر عشق ید اللّٰہی کا معیار ہی اور ہے۔ وہ عشق پر فائق ہے۔ وہ صرف آتشِ

نمرود میں کودنے والا نہیں بلکہ عرب کی آتشِ شمشیر میں بے خطر سونے والا عشق ہے۔ اقبالؔ اسی عشق کا موازنہ ایک دوسرے انداز سے کرتا ہے ؎

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرف حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی حرف رازی

اپنی بے مائگی، بے بسی اور کم تری.....اور قوتِ حیدر کی نایابی اور برتری دیکھ کر اقبالؔ کی قلبی کیفیات اپنا انداز تخاطب تبدیل کر دیتی ہیں۔ اقبالؔ انتہائی محتاط اور مقام شناس نظر آتے ہیں۔ ان کی دعا کی کیفیت بدل جاتی ہے ؎

گلستانِ زخاک من بر انگیز
نم چشم بہ خونِ لالہ آمیز
اگر شایان نیم تیغِ علیؑ را
نگاہے دہ جُو شمشیرِ علیؑ تیز

کہاں اقبالؔ زورِ حیدرؓ اور بازوئے حیدریؑ ہی ہاتھ پھیلا کر طلب کر رہے تھے اور کہاں اب تیغ علیؑ بھی مانگتے ہوئے تذبذب ہو رہا ہے۔

گوکہ شمشیر علیؑ اور زورِ حیدرؑ بالکل مختلف چیزیں ہیں لیکن ہر وہ تیغ بھی اقبالؔ کے لئے جھجھک پیدا کر رہی ہے جسے دست حیدرؑ نے مَس کیا ہو۔ اقبالؔ واقف ہیں کہ پارس، لوہے کو بھی سونا بنا سکتا ہے۔ اس لئے وہ صرف نگاہ مانگ رہا ہے۔ وہ نگاہ جو شمشیر علیؑ کی طرح جوش رکھتی ہو۔

اب اقبالؔ عرفان و آگہی حاصل کر لیتا ہے۔ اس لئے اس کے اندازِ تخاطب کے تیور ہی کچھ اور ہیں ؎

نائب حق در جہاں بودن خوش است
برعناصر حکمراں بودن خوش است
نائبِ حق، ہمچو جانِ عالم است
ہستی اُو ظلِّ اسم اعظم است

از رموز جزو و کل آگاہ بود
در جہاں قائم بامر اللہ بود
پختہ ساز و فطرت ہر خام را
از حرم بیروں کُند اصنام را
نغمہ را تارِ دل از مضراب اُد
بہرِ حق بیداریٔ او خواب اُد

اقبالؔ اسی مردِ مومن، صاحبِ فقر، صاحبِ عشق، صاحبِ سیف، صاحبِ قلم، قوی بازو، جان باز اور صاحبِ تسخیر کو ایک نئے رنگ میں دیکھ رہا ہے۔ اقبالؔ کا مردِ مومن، نائبِ حق ہے، جانِ عالم ہے، ظلِ اسمِ اعظم ہے، اس کی بیداری اور خواب بہرحق ہے، وہ حرم سے بتوں کو نکال رہا ہے۔

اقبالؔ پر وجد طاری ہے اور عقیدت گزاری اور نیازمندی سے یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے۔

خیرہ نہ کر سکا مُجھے جلوۂ دانش فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اور کبھی کہتا ہے

میں بندہ اَور کا ہوں، امتِ شاہِ ولایت ہوں

اور کبھی یہ انداز اپناتا ہے۔

نجف میرا مدینہ ہے، مدینہ ہے میرا کعبہ

اور کبھی ۔

بندہِ شاہِ لَا فتٰـــــــــــی ہوں میں

یہ ہے اقبالؔ فیضِ یادِ، نامِ مرتضٰی جس سے
نگاہِ فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے

اقبالؔ اپنے مردِ مومن اور آئیڈیل کو تاریخ میں تلاش کر لیتا ہے اور کھل کر رطب اللسان ہو جاتا ہے۔ ''اسرارِ خودی'' میں اپنے لے کو تیز کر دیتا ہے اور بہت واضح طور پر کہتا ہے:

مسلمِ اوّل شہ مرداں علیؑ
عشق را سر مایۂ ایماں علیؑ
از ولائے دود مانش زندہ اَم
در جہاں مثلِ گُہر تابندہ اَم
نرگسم وارفتۂ نظارہ اَم
درخیابانش چو بو آوارہ اَم
زمزم از جو شدز خاک من ازدست
مئے اگر ریزد زتاک من ازدست
خاکم واز مہر اُو آئینہ اَم
می تواں دیدن نوا در سینہ اَم
ازرُخِ اُدفالِ پیغمبرؐ گرفت
ملّتِ حق از شکوہش فرگرفت
قوتِ دینِ مبیں فرمودہ اَش
کائنات آئیں پذیر از دُودہ اش

مرسلِ حق کرد نامش بو تراب
حق [1] یداللہ خواند درام الکتاب

ذاتِ اُو دروازۂ شہر علوم
زیرِ فرمانش حجاز و چین دردم

اقبالؔ نے اپنے مردِ مومن کے لئے حضرت علیؑ کا انتخاب اس لئے کیا ہے کہ ان میں علم، عشق اور عمل تینوں خوبیاں بیک وقت جمع ہو گئی تھیں۔ اسی لئے..... اقبالؔ، اسرارِ خودی کی تمام تر اساس اسمائے علی المرتضیٰؑ پر قائم کرتا ہے۔ یہی اس کے کلام کی انتہا ہے۔ اقبالؔ یہاں پہنچ کر اپنے احساسات اور واردات کو ہم رنگ بنا لیتا ہے۔ اپنے مردِ مومن کے تعارف کے بعد اقبالؔ اس کی شخصیت میں گم ہو جانا چاہتا ہے۔ وہ تجلّیات کی ایک روانی دیکھتا ہے اور اپنی ذات کو اسی روانی کے لطف و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ یہی اقبالؔ کے کمال کا حاصل ہے۔

اے محوِ ثنائے تو زبانہا
اے یوسفِ کاروانِ جانہا

---

[1] اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُاللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِم

(پارہ حٰمٓ ۲۶۔ الفتح آیت ۱۰)

اے بابِ مدینۂ محبت
اے نوحِ سفینۂ محبت
اے ماحی نقشِ باطلِ من
اے فاتحِ خیبر دلِ من
اے سرِّ خط وجُوبِ و امکاں
تفسیر تو سورۃ ہائے قرآں
اے مذہب عشق را نمازے
اے سینۂ تو امینِ رازے
اے سِرِّ نبوتِ محمدؐ
اے وصف تو مدحت محمدؐ
جانم بہ غلامی تو خوشتر
سربرزدہ اَم زجیبِ قنبرؑ
از ہوش شدم مگر بہ ہوشم
گوئی کہ نصیریٔ خموشم
دانم کہ ادب بہ ضبط راز است
در پردۂ خامشی نیاز است
زاندیشۂ عاقبت رہیدَم

جنسِ غمِ آلِ تو خریدم
از جلوۂ عام بے نیازم
سوزم، گریم، پتم گدازم [1]

اقبالؔ اپنی تلاش و جستجو کے سہارے اپنی آرزو تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اب وہ سوائے اس ایک مقصود کے کائنات کی ہر شے سے بے نیاز ہے۔ اس کی خودی کی تکمیل اس کے مردِ مومنؔ کی غلامی میں مضمر ہے اور یہی اقبالؔ کے تجسّس کی منزل ہے۔

☆

[1] یہ اس نظم کا اقتباس ہے جسے اقبالؔ نماز صبح کے بعد گریہ وزاری کے ساتھ پڑھتے تھے اور جسے سر عبدالقادر نے مخزن میں اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

اقبالؔ کا مسلک

دراصل یہ مضمون میں نہ لکھتا مگر کیا کروں میرے سامنے قاضی محمد عدیل عباسی کا مضمون ''اقبالؔ کا مذہب'' ہے جو ''مطالعہ اقبالؔ'' مجموعہ مقالات اقبالؔ متعقدہ سمینار اتر پردیش اردو اکادمی میں شامل ہے۔ موصوف نے اقبالؔ کے مذہب سے بحث کرتے ہوئے کئی عبرت ناک پہلو پیش کئے ہیں جس سے ان کی خصوصی منصوبہ بند بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبالؔ جہاں اپنے معتقدات کو والہانہ پن سے پیش کرتے ہیں اسے موصوف شاعرانہ انداز سخن گردانتے ہیں۔[1] بس ان کے اسی انداز فکر نے مجھ سے یہ مضمون لکھوالیا۔

اقبالؔ ہمارے ان اہم مفکروں میں ہیں جو شاعر بھی ہیں۔ لہٰذا اس کی بساط فکر شاخ نازک پر نہیں بلکہ دلائل و براہین پر ہے۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ اقبالؔ کے شعری اور نثری افکار کو ہم جھوم جھوم کر اپنے سیاسی اور دنیوی مقاصد و منشاء کے پیش نظر تو ضرور پڑھتے ہیں مگر ان کے معتقدات جس سے ان کی فکری بصیرت جلا پاتی ہے بڑی دلچسپی سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اقبالؔ نے جن دینی اور تاریخی معتقدات کو صمیم قلب سے قلم بند کیا وہ

---

[1] اقبالؔ کا مذہب: مطالعہ اقبالؔ، ص ۲۳، اتر پردیش اردو اکادمی

ان کی نجاتِ آخرت کی برتری پر منتج ہیں۔ اس کے لئے کلام اقبالؔ کے تدریجی ارتقاء اور مختلف ادوار پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

علامہ اقبالؔ کی تعمیر و تشکیل میں ان کے استاد مولانا میر حسن صاحب کا بھی گہرا اثر رہا۔ انھیں سے اقبالؔ نے اسلامیات، شعریات اور ادبیات کی تربیت حاصل کی ہے جیسا کہ اقبالؔ کے کلام سے واضح ہوا جاتا ہے۔

مجھے اقبالؔ اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

یا

وہ شمع بار گہہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو

دعا یہ کر کی خدا وند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

مولانا میر حسن کا عقیدہ معلوم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل واقعہ ثبوت فراہم کرتا ہے جسے عبدالمجید سالک نے ''ذکر اقبالؔ'' میں نقل کیا ہے:

''قادیان کے مولوی حکیم نورالدین جموں میں رہتے تھے اور اکثر شاہ صاحب یعنی سید میر حسن شاہ صاحب استاد

اقبالؔ سے ملنے کے لئے سیالکوٹ آیا کرتے تھے۔ ایک بار شاہ صاحب ان کی مثایعت کے لئے جا رہے تھے، مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ حکیم نور الدین نسباً فاروقی تھے اور شاہ صاحب سید۔ حکیم صاحب نے کہا ''یہ ہمارے ہی بزرگ کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے حضور سرورِ کائناتؐ سے صاف کہہ دیا کہ حسبنا کتاب اللّٰہ (ہمارے لئے صرف اللہ کی کتاب کافی ہے) اس پر شاہ صاحب نے چہک کر فرمایا کہ یہ قول بھی تو حضرت عمر ہی کا ہے کہ ''لولا علی لَھلكَ عمر (اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو گئے ہوتے۔''[1]

اس واقعہ سے استادِ اقبالؔ کے عقیدہ کا علم ہوتا ہے جس نے انھیں اپنے معتقدات کی تشکیل میں مدد دی۔ اقبالؔ کے مذہبی عقائد کی تعمیر میں حضرت علامہ شیخ عبدالعلی ہروی الطہرنی اعلی اللہ مقامہ کا بھی نمایاں رول رہا ہے۔ یہ شیخ محمد عبدہٗ مصری اور سید جمال الدین ہراتی المشہور افغانی کے ساتھیوں میں تھے اور علوم معارف قرآن میں اپنے دور میں منفرد و مسلّم مقام کے مالک تھے۔ مصر، ایران اور عراق میں اپنی لیاقتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔

---

[1] ذکر اقبالؔ، عبدالمجید سالک، ص ۲۸۳

۱۹۱۵ء یا ۱۹۱۶ء میں لاہور میں تشریف لائے تھے۔ علامہ اقبالؔ ان کے علوم و معارف سے بہت زیادہ متاثر و مستفید ہوئے۔ کچھ دنوں علامہ ہروی کی فارسی تقاریر کا ترجمہ اردو میں اقبالؔ بھی کرتے رہے۔ اقبالؔ علامہ ہروی سے کس قدر متاثر تھے اس کا ثبوت کتاب ''شاد اقبالؔ'' میں آسانی سے مل جاتا ہے۔ یہ کتاب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شادؔ صدر اعظم حیدر آباد اور حکیم مشرق علامہ اقبالؔ کے خط و کتابت پر مشتمل ہے۔ علامہ اقبالؔ کے خطوط سے چند اقتباس پیش کئے جاتے ہیں:

''..... ہاں! میں عرض کرنا بھول گیا کہ لاہور میں کچھ عرصہ سے ایک بہت بڑے ایرانی عالم مقیم ہیں یعنی سرکارِ علامہ شیخ عبدالعلی طہرانی۔ معلوم نہیں کہ کبھی ان کا حیدر آباد سے بھی گزر ہوا یا نہیں۔ عالم معتبر ہیں مذہباً شیعہ ہیں مگر مطالب قرآن بیان فرماتے ہیں تو سوچنے سمجھنے والے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ علم جفر میں کمال رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا ہوں۔ اگر اس موسم میں سرکار لاہور کا سفر کریں تو خوب ہو کہ یہ آدمی قابل زیارت ہیں۔''[1]

مخلص اقبالؔ، لاہور، مورخہ ۳۱/ اکتوبر ۱۹۱۶ء

---

[1] شاد اقبال، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اعظم اسٹیم پریس، حیدر آباد، ص ۷

اس کے جواب میں مہاراجہ کرشن پرساد نے تحریر فرمایا:

"..... ہمیں ابھی سرکار علامہ ہروی سے ملاقات کرنا باقی ہے۔ میں ان کا غائبانہ مشتاقِ ملاقات ہوں مجھے علم نہیں نہ یاد ہے کہ حیدرآباد میں یہ کبھی آئے ہوں۔ میری طرف سے سلام شوق ملاقات مزاج پرسی کیجئے اور کہیئے کہ علم جفر کے مبارک احکام کے اثر سے مجھے بھی کچھ حصہ ملنا چاہئے۔"[1]

فقیر شاد ۱۶ نومبر ۱۹۱۶ء

اس کے جواب میں علامہ اقبال کا خط ملاحظہ ہو:

"نوازش نامہ ابھی مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس گزار ہوں۔ سرکار علامہ عبد العلی ہروی طہرانی سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ نہایت مخلصانہ سلام آپ کی خدمت میں پہنچاتے ہیں۔ اس سے پیشتر امرائے دکن میں سے کسی سے آپ کے اوصاف کا تذکرہ سن چکے ہیں۔ فرماتے تھے حیدرآباد دکن کا سفر کروں گا تو مہاراجہ بہادر سے ضرور ملاقات کروں گا۔ دوسری ملاقات کے موقع پر

---

[1] شاد اقبال، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد، ص ۹

اور باتیں بھی ان سے کروں گا اور جو کچھ بھی وہ فرمائیں
گے دوسرے خط میں عرض کروں گا۔''[1]

مخلص دیرینہ محمد اقبالؔ، ۴؍دسمبر ۱۹۱۶ء

خطوط کی ان عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ جیسا عالم و مفکر سرکار علامہ ہروی کا کس قدر معتقد تھا اور ان کے علم و معارف قرآن سے فیض یاب ہونے کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا اور دینی مسائل میں ان کے علم سے مستفید ہوتا تھا۔ اقبالؔ نے سرکار علامہ ہروی سے ملاقات کے بعد اپنی نظموں میں خصوصی طور سے ذکر فضائل محمدؐ و آلِ محمدؐ پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ جو آخری عمر تک جاری رہا۔ اس کے ابتدائی حصہ اور آخری دور کے کلام میں بڑا واضح فرق نمایاں ہے جو ان کے اعتقادات میں تبدیلی کی غمازی کرتا ہے۔ ''ضرب کلیم'' جس کی اشاعت اول جولائی ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی اور اس کا ساتواں ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھیا۔ اس میں اقبالؔ کا یہ اقرار موجود ہے:

معلوم ہے تجھ کو میرے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے[2]

---

[1] شاد اقبال، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد، ص ۱۰
[2] ضرب کلیم طبع ہفتم، ص ۳۷

اقبالؔ کے نظریات و اعتقادات میں تبدیلی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ''رموزِ بے خودی'' کے آخری صفحات پر اقبالؔ کا اعتراف ملتا ہے۔

سالہا بو دم گرفتار شکے
از دماغ خشک من لا ینفکے
حرف از علم الیقین ناخواندۂ
در گماں آباد حکمت ماندۂ
ظلمتم از تاب حق بیگانہ بود
شامم از نورِ سحق بیگانہ بود
آخر از پیمانۂ چشم چکید
در ضمیر من نواہا آفرید [1]

مندرجہ بالا اشعار سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ پہلے عرصہ تک شک و شبہہ میں گرفتار تھے اور آخر کار ان کا ضمیر بیدار ہوا اور وہ حق بات کہنے پر مجبور ہو گئے۔ گرچہ اقبالؔ کی طبیعت ابتداء سے ہی مائل بہ تشیّع تھی جیسا کہ ''بانگِ درا'' میں صاف لکھا ہے۔ یہ ان کا ابتدائی کلام ہے۔

ہے اس کی طبیعت میں تشیّع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اس کی زبانی

---

[1] رموزِ بے خودی، اشاعت چہارم ۱۹۵۵ء

یا

بغض اصحاب ثلاثہ سے نہیں اقبالؔ کو
دق مگر ایک خارجی سے آ کے مولائی ہوا

(باقیات اقبالؔ)

اقبالؔ نے اپنے عقیدے کو جن مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے اس میں کتاب اللہ، رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی تعلیمات ونظریات میں کسی اور مکتبہ فکر کو راہ نہیں ملتی ہے۔ اس کے لئے اقبالؔ کی مشہور ومعروف نظم ''ابر گہر بار'' کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھی یہی بعد میں ''فریادِ اُمّت'' کے عنوان سے شایع ہوئی:

اے کہ تھا نوحؑ کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیمؑ کو آتش میں بھروسہ تیرا
اے کہ مشعل تھا ترا ظلمت عالم میں وجود
اور نورنگہِ عرش تھا سایہ تیرا
اے کہ پرتو ہے تیرے ہاتھ کا مہتاب کا نور
چاند بھی چاند بنا پا کے اشارہ تیرا
گرچہ پوشیدہ رہا حسن ترا پردوں میں

ہے عیاں معنی لولاک سے پایا تیرا[1]

ان اشعار میں اقبالؔ اللہ سے نہیں بلکہ رسول اللہ سے مخاطب ہیں اور ان میں اقبالؔ کا عقیدہ بڑا واضح ہو جاتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی شیعی ہے کہ رسولؐ و نفس رسولؐ قبل از ولادت بھی غائبانہ طور سے انبیائے ماسلف کی باذن اللہ امداد فرماتے رہے ہیں۔ اسی نظم میں اقبالؔ نے اپنے عقیدے کی مزید توضیح کر دی ہے۔

دیکھ اے نوح کی کشتی کو بچانے والے
آیا گرداب حوادث میں سفینہ اپنا
اس مصیبت میں اگر تو ہی ہماری نہ سنے
اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانہ اپنا

''ان اشعار میں چوتھا شعر نورِ حضرت محمد مصطفیٰؐ کا پردوں میں پوشیدہ رہنے کا اقرار ثابت کر رہا ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عبداللہ تک جس جس کے قلب اطہر میں نورِ رسولؐ اکرم رہا اور تمام بطنوں میں جن میں بحکم الٰہی منتقل ہوتا رہا سب کی سب مومن و مسلم برگزیدہ اور پاکیزہ ہستیاں تھیں۔ یعنی حضرت سرور کائنات کے آباؤ

---

[1] باقیاتِ اقبالؔ، ص ۱۵۳۔۱۵۴

اجداد سب مومن کامل اور اپنے اپنے وقت کے مقدس
ترین افراد تھے۔ یہ عقیدہ بھی صرف شیعی ہے ورنہ بقیہ
تمام فرقے والدین رسولؐ ونفس رسولؐ کے معاذ اللہ کافر
ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔''[1]

اسی نظم ''فریادامت'' میں اقبالؔ کا یہ بھی اشعار توجہ طلب ہیں۔

واعظوں میں یہ تکبّر کہ الٰہی توبہ
اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں
ان کے ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا
ہاں مگر وعظ میں دنیا کو برا کہتے ہیں
مقصد لحمک لحمی پہ کھلی ان کی زباں
یہ تو اک راہ سے تجھ کو بھی برا کہتے ہیں
تیرے پیاروں کا جو یہ حال ہوا اے شافع حشر
میرے جیسوں کو تو کیا جانئے کیا کہتے ہیں [2]

تیسرے شعر میں حدیث رسول کائناتؐ کی طرف واضح اشارہ ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، تفسیر درمنثور، شرح فقہ اکبر، فتاویٰ عبدالحیٔ لکھنوی، فتاویٰ رشیدیہ، از رشید احمد گنگوہی وغیرہ وغیرہ۔

[2] نظم فریادامت، باقیات، ص ۱۵۵۔۱۵۶

ارشادِ سرورِ عالم ہے "یا علی الحمك لحمی و جسمك جسمی و دمك دمی .... یہ متفق علیہ حدیث سرورِ عالم ہے (یا علی آپ کا گوشت میرا گوشت ہے اور آپ کا جسم میرا جسم ہے۔ آپ کا خون میرا خون ہے) جن لوگوں نے اس سے انکار کیا وہ اقبالؔ کے نزدیک منکرِ رسالت ہیں۔

اقبالؔ اہل مدرسہ اور اہل خانقاہ کا بھی بھرم کھول دیتا ہے۔ اہل مدرسہ اور شیخ حرم کی واضح لفظوں میں مذمت کی ہے۔ ملاحظہ ہو

زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
چہ بے خبرز مقام محمدؐ عربی است
(ارمغان حجاز)

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا اِلٰہ الا اللّٰہ
(بال جبریل)

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بو ذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادر زہراؑ
(بالِ جبریل)

حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت اویس قرنیؓ، مقتدر اصحاب رسول ہیں جو شیخ حرم کے عتاب کا نشانہ بنے ہوئے ہیں اور حضرت معصومہ جناب فاطمہ

زہراؔ کے تو نشانِ مزار تک کو مٹا دیا گیا ہے۔ اقبالؔ کے مندرجہ بالا شعر میں اسی اس وقت وہی سرزمین حرم پاک ہے جو وہاں کی حکومت اپنے نظریات کو تھوپ رہی ہے۔ اس کے خلاف سخت احتجاج پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہتے رہے کہ ؎

حرم رسوا ہوا شیخ حرم کی کم نگاہی سے

(بانگِ درا)

اقبالؔ کی نگاہوں میں پیران کلیسا اور شیخان حرم ایک ہی طرح کے ہیں ۔ وہ صوفیانہ مسلک کا بھی حامی نہیں رہا بلکہ مشہور بریلوی عالم مولوی دیدار علی نے ان پر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا تھا۔ [۱]

مسلک وطریقہ صوفیا سے وہ ہمیشہ بیزار رہے اور ان کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ ان کی مخالفت میں پایا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک

نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

(بالِ جبریل)

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی

رہ گئے صوفی و ملاّ کے غلام اے ساقی

---

[۱] ذکر اقبالؔ عبدالمجید سالک، ص ۳۶ بحوالہ اخبار زمیندار، لاہور، ۵/اکتوبر ۱۹۲۵ء

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ، ملاّ سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم
کیا صوفی و ملاّ کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و ملاّ کی ناخوش اندیشی
کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک روز
کتاب صوفی و ملاّ کی سادہ اوراقی

نہ با ملاّ نہ با صوفی نشینم
تو می دانی کہ من آنم نہ اینم

(ارمغانِ حجاز)

دلِ ملاّ گرفتار غمے نیست
نگاہے ہست در چشمش نمی نیست
ازاں بگر تختم از مکتب او
کہ در ریگ حجازش زمزمے نیست

(ارمغانِ حجاز)

اقبالؔ صوفی اور ملاّ دونوں سے اپنے آپ کو علیحٰدہ رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے دل ملاّ غم سے آشنا نہیں اور اس کی آنکھیں پرنم نہیں۔ تعلیمات ملاّ پر اقبالؔ خود غمگیں ہیں کہ وہاں حجاز تو ہے آب زم زم نہیں ان کے کلام میں صوفی وملاّ کے تعلیمی نقائص کا بھی ذکر ملتا ہے ؎

زمن بر صوفی و ملاّ سلامے
کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت
خدا و جبریلؑ و مصطفیٰؐ را

(ارمغانِ حجاز)

اقبالؔ صوفی و ملاّ دونوں سے بیزار ہے۔ اس لئے کہ وہ پیغام خدائے تعالیٰ تو دیتے ہیں مگر اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں کہ جس سے خود خدا، جبرئیل اور رسول کائنات حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟

دراصل علامہ اقبالؔ عشق کو دین کی اصل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر عشق نہیں تو مسلمانی بھی کفر کے ذیل میں آجاتی ہے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

اقبالؔ کو عقل وخرد سے اجتناب ہے اس لئے کہ یہ منافی عشق ہے

اور جو مومن ہیں وہی عشق کی دولت سے مالا مال ہیں۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

(بانگِ درا)

زندگی را شرع و آئین است عشق
اصل تہذیب است دیں، دین است عشق
علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں
مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را نامم، نا ما ممکن است

(مثنوی اسرار خودی)

بغیر عشق کے علم طاغوتی طاقتوں کا امین بن جاتا ہے اور علم عشق کے ساتھ جب ہوتا ہے تو وہ مقام لاہوت پر پہنچ جاتا ہے۔ صاحبان ایمان عشق سے ہیں اور عشق کی اصل بنیاد ایمان پر ہے۔ اسی لیے علامہ اقبالؔ کہتے ہیں۔

عشق دم جبریلؑ عشق دم مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام

عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کی مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات
(بالِ جبریل)

لیکن علامہ اقبالؔ کے امعان نظر میں انتہائے عشق کمالِ عشق و مستی، ظرف حیدرؑ اور عشق کا زوال حرفِ رازی:

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؑ
زوالِ عشق و مستی حرف رازی [1]
(بال جبریل)

اور حضرت امام حسنؑ و حسینؑ علیہم الصلاۃ والسلام کی والدہ ماجدہ خاتونِ جنت حضرت فاطمہ زہراؑ پرکار عشق کا مرکز ہیں ؎

مادرِ آں مرکزِ پرکار عشق
مادر آں قافلہ سالار عشق

---

[1] فخر الدین رازی صاحب تفسیر کبیر

آں امام عاشقاں پور بتولؑ
سرو آزادے زبستان رسولؐ

(مثنوی رموزِ بے خودی)

اور عشق والوں کا سرمایۂ ایمان ذاتِ علی ابن ابی طالبؑ ہے۔

مسلم اول شہ مرداں علیؑ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؑ
از ولائے دود مانش زندہ ام
در جہاں مثل گہر تابندہ ام
مرسل حق کردِ نامش بوتراب
حق یداللہ خواند در اُمُّ الکتاب
بانوئے آں تاجدار بَل اتیٰ
مرتضیٰؑ مشکل کشا شیر خدا
ازرخ او فال پیغمبر گرفت
ملتؔ حق از شکوہ ہش فر گرفت
قوتِ دین مبیں فرمودہ اش
کائنات آئین پذیر از دودہ اش
ہر کہ دانائے رموز زند گیست

سِرّ اسمائے علیؑ داند کہ چیت
ہر کہ در آفاق گردَد بو تراب
باز گرداند زمغرب آفتاب
زیر پاش ایں جاشکوہ خیبر است
دست اُو آں جاقسیم کوثر است
از خود آگاہی ید اللّٰہی کند
از یداللّٰہی شہنشاہی کند
ذات او دروازۂ شہر علوم
زیر فرمانش حجاز و چین و روم

اس کے بعد ''رموزِ بے خودی'' میں واقعہ کربلا کی دائمی دعوتِ حق کو عشق اور عقل کی بحث سے شروع کر کے اس نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں۔

آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد
عشق با عقل ہوس پرور چہ کرد
آں امام عاشقاں پور بتولؑ
سرو آزادے زبستانِ رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر

بہر آں شہزادۂ خیرالملل
دوشِ ختم المرسلیں نعم الجمل

سرخ رو عشق غیور از خون او
شوخیٔ ایں مصرع از مضمونِ او

درمیانِ اُمت آں کیواں جناب
ہمچوحرف قل ھو اللہ درکتاب

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

چوں خلافت رشتہ از قرآن گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم
چو سحاب قبلہ باراں در قدم

سر زمین کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

تاقیامت قطع استبداد کرد

موج خونِ او چمن ایجاد کرد
بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا اِلٰہ گردیدہ است
مدّعایش سلطنت بودے اگر
خود نہ کردے باچنیں ساماں سفر
دشمنانِ چوں ریگ صحرا لاتعد
دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد
سرِّ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود
خونِ او تفسیر ایں اسرار کرد
ملتؔ خوابیدہ را بیداد کرد
تیغ لاچوں از بیاں بیروں کشید
از رگِ اربابِ باطل خوں کشید
نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوانِ نجات مانوشت
رمزِ قرآں از حسینؑ آموختیم
زآتش او شعلہ ہا اندوختیم

شوکت شام و فر بغداد رفت
سطوتِ غرناطہ ہم ازیاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز
اے صبا اے پیکر دور افتادگاں
اشک مابر خاک پاک اُو رساں

مثنوی اسرار خودی اور رموزِ بے خودی میں کلام اقبالؔ تمام مکتبۂ فکر اسلامیہ کو دعوت دے رہا ہے۔ وہ رسولؐ و آلِ رسولؐ کی محبت میں سرشار ہے۔ اس کے فارسی اور اردو کلام میں اس کے معتقدات کی واضح مثالیں ملتی ہیں کہ وہ اصل میں مولائی و قلندر تھا۔ ملاحظہ ہو ؎

قلندر میل تقریر ندارد
بجز ایں نسخہ اکسیرے ندارد
ازاں کشت خرابے حاصل نیست
کہ آب از خونِ شبیرؑ ی ندارد

(ارمغان حجاز)

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتداء ہے اسمعیلؑ

(بالِ جبریل)

حقیقت ابدی ہے مقام شبیریؑ
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

(بالِ جبریل)

ہوں مرید خاندانِ خفتۂ خاک نجف
موج دریا آپ لے جائے گی ساحل پر مُجھے

یہ ہے اقبالؔ فیض یا دنام مرتضٰی جس سے
گناہ فکر میں خلوت سرائے آسماں تک ہے

ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے وہ یہ کہ تمام فرقہ اسلامیہ میں امامت کا تصور صرف خالص شیعی عقیدہ ہے۔ جہاں بعد رسالت، امامت کا عقیدہ ہے۔ اسی بنا پر اس فرقہ کو امامیہ کہتے ہیں اور بعد از رسول کائنات بارہ معصومین میں عقیدہ رکھنے پر اثنا عشریہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؔ بھی امامت کے قائل نظر آتے ہیں۔ ہدایت اور رہنمائی کے لئے نائب حق کے وجود میں یقین رکھتے ہیں۔ اس کی مثال مثنوی اسرار خودی ورموزِ بے خودی میں آسانی سے مل جاتی ہے۔ وہ اساس اسلام کے لئے تین

جزو پیش کرتے ہیں۔ توحید، نبوت اور نیابت الٰہیہ یعنی امامت اور ان کے لئے مثالیں صرف محمدؐ و آلِ محمدؐ کے ہی پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ خودی کی ترتیب کے ذیل میں تین اہم مرحلے، اطاعت وضبط نفس اور آخری مرحلہ نیابت الٰہیہ یعنی امامت کے تحت اسرار اسمائے علی مرتضیٰؑ بیان فرما کر اصل حقیقت اسلام اجاگر کردی ہے اور ''بے خودی'' کے تحت ''سرِّ حادثہ کربلا'' کو اولّیت دے کر اس کے تحت عقل و عشق اور قرآن کی حقیقت واضح کی ہے اور اس کے لئے نمونے بھی آلِ محمدؐ سے ہی منتخب کئے ہیں۔ یعنی امام عاشقان پور بتولؑ امام حسینؑ۔ اقبال امام کے وجود کو امت کی بقا کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ ارمغانِ حجاز ان کی زندگی میں شایع ہونے والا آخری مجموعہ کلام ہے۔ اس میں تحریر کرتے ہیں۔

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است

ہنوز ایں کارواں دور از مقام است

زکار بے نظامِ روچہ گویم

تو می دانی کہ امت بے امام است

(ارمغان حجاز)

بغیر امام کے امت میں انتشار و خلفشار ہے۔ چاروں طرف بے

اطمینانی اور بد نظمی ہے۔اس لئے امامت اصول دین میں شامل ہے۔ نیابت الٰہیہ کے زیرعنوان اقبالؔ نے نائب حق کی مندرجہ ذیل صفات تحریر کی ہیں اور نائب حق کی نشاندہی بھی کی ہے۔

نائب حق ہم چو جان عالم است
ہستیِ اُو ظلِ اسم اعظم است
از رموزِ جزو و کل آگاہ بود
در جہاں قائم بہ امر اللہ بود
پختہ ساز و فطرتِ ہر خام را
از حرم بیروں کُند اصنام را

مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ بعد سرورِ کائنات نیابت الٰہیہ کو امر اللہ قرار دیتے ہیں یعنی منصوص من اللہ منجانب اللہ۔ امامت کے سلسلے میں یہ بھی مخصوص شیعی عقیدہ ہے۔ آخری مصرع ''از حرم بیروں کند اصنام را'' کہہ کر واضح طور پر نشاندہی کر دی ہے۔ یعنی اشارہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی طرف ہے جب دوش ختم المرسلین پر بلند ہو کر حضرت علیؑ نے کعبہ میں بت شکنی کی تھی اور ''تو می دانی کہ امت بے امام است'' کہہ کر غیبت امامؑ کی طرف واضح اشارہ کر دیا ہے۔ وہ حقیقت منتظر کا لباسِ مجاز میں

انتظار کر رہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

دنیا کو ہے اس مہدیؑ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

(ضرب کلیم)

نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں تیرے باریک بینوں میں

یا

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھائے رخ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

ان اشعار میں اقبالؔ نے امامت کی تشریح واضح دلائل سے پیش کی

ہے جو شخص طالب دنیا ہے اور طلب دنیا اس کا نصب العین ہے تو وہ امامت کا اہل نہیں۔ وہ شخص جو لوگوں کو آخرت سے آگاہ کرتا ہے، موت کی یاد دہانی کراتا ہے، زمانے کے لہو ولعب کو ٹھکراتا ہے، خوف خداوندی رکھتا ہے اور خوف سلاطین سے ذہنوں کو آزاد کراتا ہے وہی امامت کا اہل ہے۔

کہا نہیں جا سکتا کہ ان اشعار کا محرک اقبالؔ کے لئے کون سا واقعہ یا نظریہ بنا۔ مگر میرے سامنے مولائے کائنات کا کلام بلاغت نظام ''نہج البلاغہ'' ہے جس میں جنگ صفین کا ایک عبرت انگیز واقعہ مذکور ہے:

''جنگ صفین کے موقع پر مولائے کائنات علی ابن طالب اپنے جانبازوں کے ساتھ روانہ ہو رہے تھے کہ جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ مولا گھوڑے سے اترے تا کہ جوتی کی مرمت کروا سکیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس مولا کے نزدیک کھڑے تھے اور اس ٹوٹی ہوئی جوتی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بہت ہی بوسیدہ اور شکستہ تھی۔ جا بجا چمڑے کے ٹکڑے ٹنکے تھے۔ مولا نے حضرت عبداللہ ابن عباس کی کیفیت دیکھ کر سوال کیا ''اے عبداللہ! اس جوتی کی قیمت کیا ہوگی؟'' عبداللہ ابن عباس نے مزید حیرت سے

دیکھا اور کہا کہ ''اس جوتی کی قیمت تو ایک درہم بھی نہیں ہے۔ مولائے کائنات نے فرمایا ''اے عبداللہ! قسم ہے اس پروردگار کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ میرے لیے یہ حکومت اس ٹوٹی ہوئی جوتی سے بھی کم قیمت رکھتی ہے۔''

(نہج البلاغۃ)

علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور کلام میں جو قلندرانہ سرمستی ملتی ہے وہ اس طرح کے واقعے کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کا فقر آقائے قنبرؑ کا فقر تھا۔ ملاحظہ ہو۔

جہاں سے پلتی تھی اقبالؔ روح قنبرؑ کی
مجھے بھی ملتی ہے روزی اسی خزینے سے
ہمیشہ وردِ زباں ہے علیؑ کا نام اقبالؔ
کہ پیاس روح کی بجھتی ہے اس نگینے سے

(باقیات)

مرے لیے ہے فقط زور حیدریؑ کافی
تیرے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک

بے جرأت رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی
(ضربِ کلیم)

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف
(بالِ جبریل)

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسداللّٰہی

نہ تخت و تاج میں نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے
(بالِ جبریل)

اوراس قلندری کے لیے بوئے اسداللّٰہی اورخونِ حسینؑ کی ضرورت ہے کیونکہ ''اک فقر ہے شبیریؑ اس فقر میں ہے میری''

فقر مومن چست تسخیر و جہاد
بندہ از تاثیر او مولا صفات

اقبالؔ اللہ کی بارگاہ میں اہل بیت علیہم السلام کا واسطہ دے کر جس

طرح آہ وزاری کرتا ہے اس سے بھی اس کی عقیدے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

واسطہ دوں گا اگر لخت دل زہراؑ کا میں
غم میں کیونکر چھوڑ دیں گے شافع محشر مجھے

رونے والا ہوں شہیدِ کربلا کے غم میں، میں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقی کوثر مجھے

دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغ عشق اہل بیت
ڈھونڈھتا پھرتا ہے ظلِّ دامنِ حیدرؑ مجھے

جس طرح مجھ کو شہید کربلا سے پیار ہے
حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

فیض اقبالؔ ہے اُسی در کا
بندۂ شاہ لا فتیٰ ہوں میں

سینۂ پاک علیؑ جس کا امانت دار تھا
اے شہ ذی جاہ تو واقف ہے ان اسرار کا

کرم کرم کہ غریب الدّیار ہے اقبالؔ
مریدِ شاہِ نجف ہے غلام ہے تیرا

نجف میرا مدینہ ہے مدینہ ہے مرا کعبہ
میں بندہ اور کا ہوں امت شاہ ولایت ہوں

جہاں سے پلتی تھی اقبالؔ روح قنبر کی
مجھے بھی ملتی ہے روزی اسی خزینے سے

ہمیشہ ورد زباں ہے علیؑ کا نام اقبالؔ
کہ پیاس روح کی بجھتی ہے اس نگینے سے

اقبالؔ نے کھل کر باطل کے نظریات کی مخالفت کی ہے چنانچہ اکبر الہ آبادی کے نام اپنے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

''۸/۱ اکتوبر ۱۹۱۵ء

.....شیعوں کے متعلق آپ نے خوب لکھا ہے۔
میرا مدت سے یہی خیال ہے کہ امامت کا مسئلہ سوسائٹی کو
انتشار سے بچانے والا ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں جب

مذہبی حقائق کا معیار عقل ہو۔ میں نے کئی دفعہ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ صوفی بننے کی نسبت شیعہ ہو جانا ضروری ہے۔ اگر تقلید ضروری ہے تو اولادِ مرتضیٰؑ سے بڑھ کر اور کون امام ہوسکتا ہے..... مذہب بغیر قوت کے محض ایک فلسفہ ہے۔ یہ نہایت صحیح مسئلہ ہے میں گذشتہ دس سال سے اسی پیچ وتاب میں ہوں.....''[1]

ظاہر ہے اقبالؔ نے مسئلہ امامت کو صحیح وحق بجانب تسلیم کیا ہے۔ وہ مسلک صوفیا کو پسند نہیں کرتا۔ ہاں وہ شیعت کے قریب ضرور تھا لیکن وہ اول و آخر مردِ قلندر تھا اور ببانگ دُہل کہتا ہے ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

اور یہ بُوئے اسداللّٰہی حضرت علی ابن ابی طالب سے ملی ہے کیونکہ اسداللہ حضرت علیؑ مشکل کشا کا لقب ہے۔

اقبالؔ کو اسد کردگار سے کس درجہ عشق تھا اس کا اندازہ ان کی فارسی نظم ''سپاس جناب امیر المومنین علیہ السلام'' سے ہوتا ہے جسے جسٹس سر شیخ

---

[1] خط نمبر ۴، اکبر الہ آبادی کے نام۔ اقبالؔ نامہ حصہ دوم، ص ۴۴ ناشر شیخ محمد اشرف (اہل حدیث) مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم.اے.

عبدالقادر مرحوم مدیر رسالہ مخزن لاہور نے اپنے اس ادارتی نوٹ سے شائع کیا ہے ملاحظہ ہو:

''فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں۔ تاہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم بہ اظہار عقیدت شیخ محمد اقبالؔ صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں۔''[1]

یہ نظم 'باقیات اقبالؔ'' ص ۱۰۲ تا ۱۰۵ ارخت سفر، ص ۱۰۷۔۹ اا پر بھی درج ہے۔

اے محو ثنا تو زبانہا
اے یوسف کاروانِ جانہا

(اے وہ جس کے لئے (مخلوق خدا) کی زبانیں مصروف ثنا ہے۔ اے کاروانِ حیات کے یوسف)

اے باب مدینۂ محبت
اے نوحؑ سفینۂ محبت

(اے مدینۂ محبت کے دروازے، اے سفینۂ محبت کے نوح)

---

[1] مخزن لاہور جنوری ۱۹۰۵ء

اے حامی نقش باطل مَن

اے فاتح خیبر دلِ مَن

(اے میرے دل کے باطل نقش کو مٹانے والے، اے میرے دل کے خیبر (قلعہ باطل) کے فاتح)

اے سرِّ خطِ و جوب و امکاں

تفسیر تو سورہائے قرآں

(اے وجوب و امکاں (خالق و مخلوق) کے خط کی ابتدا قرآن کی ساری سورتیں آپ ہی کی تفسیر ہیں)

اے مذہب عشق را نمازے

اے سینۂ تو امین رازے

(اے میرے عشق کی نماز (وہ جو مذہب عشق کے لئے نماز ہے اے وہ جس کا سینۂ راز خداوندی کی امانت دار ہے)

اے سرِّ نبوت محمدؐ

اے وصف تو مدحتِ محمدؐ

(اے نبوت محمد مصطفےٰ صلی اللہ وعلیہ وسلم کے راز اے وہ جس کی توصیف، حقیقت میں حضرت محمد رسول اللہ ہی کی مدحت ہے)

گردوں کہ بہ رفعتِ ایستادست

از بامِ بلند تو فتادست

(یاعلیؑ ! آسماں اپنی ساری بلندیوں کے باوجود آپ کے بام بلند کے سامنے جھکا ہوا ہے)

ہر ذرّہ در گہت چو منصور

در جوشِ ترانۂ انا الطّور

(آپ کی درگاہ پاک کا ہر ذرۂ خاک، انا الحق کہنے والے منصور کی طرح جوش میں انا الطّور (میں ہی طور ہوں) کا ترانہ (مستانہ) گاتا ہے (طور پر تجلّی الٰہی ہوئی تھی)

بے تو نتواں بہ او رسیدن

بے او نتواں بہ تو رسیدن

(یاعلیؑ ! آپ کو چھوڑ کر اللہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ نہ ہی خدا کے بغیر آپ تک کسی کی رسائی ہوسکتی ہے)

فردوس زتو چمن در آغوش

از شانِ تو حیرت آئینہ پوش

(یاعلیؑ ! جنت آپ ہی کی وجہ سے ''چمن در آغوش'' یعنی جنت ہے آپ کی

شان پرتو سے آئینہ ورطۂ حیرت میں گم ہے)

جانم بہ غلامیٔ تو خوشتر

سر برزدہ ام حبیبِ قنبرؓ

(میری جان آپؐ کی غلامی میں نہایت خوش وخرم ہے میں تو آپؐ کے غلامِ بے دام قنبرؓ کا ہم گریباں ہوں)

ہشیارم و مست بادۂ تو

چوں سایہ زپا فتادۂ تو

(ہاں، ہاں) میں ہوش میں ہوں اور آپ کی صحبت کے نشہ میں مست (مدہوش) ہوں، سرمستی کے عالم میں سایہ صفت آپ کے پاؤں تلے ہوں)

از ہوش شدم مگر بہ ہوشم

گوئی کہ نصیریؔ خموشم

(تم سمجھتے ہو شاید) میں ہوش کھو بیٹھا ہوں میں اتنے ہوش میں ہوں کہ اگر تم کہو میں نصیریؔ ہو گیا ہوں، تو بھی خاموش رہوں گا)

دانم کی ادب بہ ضبطِ راز است

در پردۂ خامشی نیاز است

(میں جانتا ہوں کہ ضبط راز ہی ادب محبت ہے اور نیاز خاموشی کے پردے میں ہے)

امّا چہ کنم مئے تو لاؔ

تند است بروں فتدز مینا

(لیکن میں کیا کروں کہ مئے تولاّ ئے علیؑ اتنی تند ہے کہ میان سے باہر ہوئی جاتی ہے (یعنی کے چھپائے نہیں چھپتی) چھلک پڑتی ہے)

زاندیشۂ عاقبت رہیدم

جنسِ غمِ آل تو خریدم

(اب میں اندیشۂ عاقبت سے آزاد ہوں کیونکہ میں نے آپ کی آلِ اطہار کے غم کوخرید لیا ہے)

(ق)

فکرم چو بہ جستجو قدم زد

در دیر شدہ و در حرم زد

(میری فکر نے جب جستجو کے لئے قدم اٹھائے تو جو قدم دہر میں تھا وہ حرم میں جا پڑا) اس کی روداد کچھ اس طرح ہے۔

پیچیدہ بخود چو موجِ دریا

آوارہ چو گرد بادِ صحرا

(سمندر کی موج کی طرح اپنے ہی آپ میں پیچ وتاب کھاتا رہا۔ بیاباں کے

بگولے کی طرح چکر کھاتا رہا)

واماندہ زدردِ نارسیدن

در آبلۂ شکستہ دامن

(منزل تک نارسائی کے صدمے اور اپنے پاؤں کے چھالوں کے پھٹ جانے سے میں شکستہ حال رہا)

(ق)

عشق تو دلم ربود ناگاہ

از کار گرہ کشود ناگاہ

یا علیؑ! (آپ کے عشق نے یکا یک میرے دل پر چھاپہ اور ناگاہ میری عقدہ کشائی فرمائی)

آگاہ و ہستی و عدم ساخت

بت خانۂ عقل را حرم ساخت

(آپؑ کے عشق نے ہستی و عدم سے آگاہ کر دیا اور میری عقل و فکر کے بت خانہ کو حرم (الٰہی) بنا دیا)

چوں برق بخز منم گزر کرد

از لذّت سوختن خبر کرد

(آپ کا عشق میرے خرمن ہستی پر سے بجلی کی طرح گذرا اور جلنے کی لذت سے مجھے آشنا کر گیا)

برباد متاعِ ہستیم داد

جامے زمئے حقیقتم داد

(آپؐ کا عشق میرے متاعِ ہستی کو برباد کر گیا مگر مجھے مئے حقیقت کے جام عطا کر گیا یعنی میں خود تو کھو گیا مگر خدا کو پا گیا)

سر مست شدم زپا فتادم

چوں عکس زخود جُدا فتادم

(میں اس عشق سے سرمست ہو کر گر پڑا ہوں، گویا سایہ کی طرح پیکر سے الگ ہو کر زمین پہ جا پڑا ہوں)

پیراہن ''ماومن'' دریدم

چوں اشک زچشم خود چکیدم

(پیراہن ''ماومن'' کو میں نے چاک کر ڈالا ہے، آنسو کی مانند میں خود اپنی آنکھ سے ٹپک رہا ہوں)

خاکم بفراز عرش بُردی

زاں راز کہ بادلم سپردی

(آپ نے جو راز میرے دل کے سپرد کیا، اسی نے میری خاک کو عرش کی بلندی تک پہنچا دیا)

واصل بکنار کشتیم شد

طوفانِ جمالِ رُشتیم شد

(میری کشتی کنارے لگ گئی اور میری بدصورتی طوفان حسن و جمال بن گئی)

جز عشق تو حکایتے ندارم

پروائے ملامتے ندارم

یا علیؑ! (آپ کے عشق کی حکایت کے سوا میرے پاس اور ہے بھی کیا؟ میں اس میں کسی ملامت کی کوئی پروا نہیں رکھتا)

از جلوۂ عام بے نیازم

سوزم، گریم، تپم گدازم

(میں جلوۂ عام سے بے نیاز ہوں، میں جل رہا ہوں گریاں ہوں، گریاں ہوں، تب و تاب و اضطراب میں مبتلا ہوں اور گھل رہا ہوں)

اقبالؔ اور عشقِ اہلِ بیت رسولؐ

کلام اقبالؔ کا بہ نظر غایر مطالعہ کرنے سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؔ عشقِ اہلِ بیت رسولِ اکرمؐ میں سرشار اور سراپا سپاس تھے۔ ''اسرار خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' اس کی زندہ مستند و معتبر دلیل ہیں۔ لہٰذا ''اسرارِ خودی'' سے ان کی والہانہ عقیدت وارادت کے اشعار مع ترجمہ پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے حواشی خود اقبالؔ نے مرتّب کیے ہیں۔

''ماخوذ از اسرارِ خودی''

در شرحِ اسرارِ اسمائے علیؑ مُرتضیٰؑ

مُسلمِ اوّل شہِ مرداں علیؓ

۱۔ عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ

از ولائے دود مانش زندہ ام

۲۔ در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

نرگسم وارفتۂ نظارہ ام

۳۔ در خیابانش چو بو آوارہ ام

زمزم از جو شد زخاکِ من از وست

۴۔ مے اگر ریزد زتاکِ من از وست

خاکم و از مہرِ او آئینہ ام

۵۔ می تواں دیدن نوا درسینہ ام
از رُخِ اوفال پیغمبرؐ گرفت

۶۔ ملّتِ حق از شکوہش فرگرفت
قوتِ دینِ مبیں فرمودہ اش

۷۔ کائنات آئیں پذیر از دودہ اش
مُرسلِ حق کرد نامش بو تراب

۸۔ حق ید اللہ خواند در اُم الکتاب
ہر کہ دانا ے رموزِ زندگیست

۹۔ سِرِّ اسمائے علیؑ داند کہ چیست
خاکِ تاریکے کہ نامِ او تن است

۱۰۔ عقل از بیدادِ اُو درشیون است
فکرِ گردوں رس زمیں پیمازو

۱۱۔ چشم کور و گوش ناشنوا ازو
از ہوس تیغِ دو رو دارد بدست

۱۲۔ رہرواں را دل بریں رہزن شکست

شیرِ حق ایں خاک را تسخیر کرد

۱۳۔ ایں گلِ تاریک را اکسیر کرد

مرتضیٰ کز تیغِ او حق روشن است

۱۴۔ بوتراب[1] از فتحِ اقلیمِ تن است

مرد کشور گیر از کرّاری است

۱۵۔ گوہرش را آبرو خودداری است

ہر کہ در آفاق گردو بوتراب

۱۶۔ باز گر داند زمغرب آفتاب[2]

ہر کہ زیں بر مرکبِ تن تنگ بست

۱۷۔ چوں نگیں بر خاتمِ دولت نشست

زیر پاش اینجا شکوہِ خیبر است

۱۸۔ دستِ او آنجا قسیمِ کوثر است

از خود آگاہی ید اللّٰہی کند

۱۹۔ از ید اللّٰہی شہنشاہی کند

ذاتِ او دروازۂ شہرِ علوم

۲۰۔ زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم

---

[1] حضرت علی مرتضیٰ کی کنیت (بوتراب یعنی مٹی کا باپ کی طرف تلمیح ہے۔)

[2] معجزہ رجعت خورشید

حکمراں باید شدن بر خاکِ خویش

۱۲۔ تامئے روشن خوری از تاکِ خویش

خاک گشتن مذہبِ پروانگی است

۲۲۔ خاک را اب شوکہ ایں مردانگی است

سنگ شوائے ہمچو گل نازک بدن

۲۳۔ تاشوی بنیادِ دیوارِ چمن

از گِلِ خود آدمے تعمیر کن

۲۴۔ آدمے را عالمے تعمیر کن

گر بنا سازی نہ دیوار و درے

۲۵۔ خشت از خاکِ تو بند و دیگرے

اے زجورِ چرخِ نانہجار تنگ

۲۶۔ جامِ تو فریادیٔ بیدارد سنگ

نالہ و فریاد و ماتم تا کجا

۲۷۔ سینہ کو بیہائے پیہم تا کجا

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات

۲۸۔ لذّتِ تخلیق قانونِ حیات

خیز و خلّاقِ جہانِ تازہ شو

۲۹۔ شعلہ در برکن خلیلیؑ آوازہ شو

با جہانِ نا مساعد ساختن

۳۰۔ ہست در میداں سپر اند اختن

مردِ خوددارے کہ باشد پختہ کار

۳۱۔ بامزاجِ او بسازد روزگار

گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں

۳۲۔ می شود جنگ آزما با آسماں

بر کند بنیادِ موجودات را

۳۳۔ می دہد ترکیبِ نو ذرّات را

گردشِ ایّام را برہم زند

۳۴۔ چرخِ نیلی فام را برہم زند

می کند از قوتِ خود آشکار

۳۵۔ روزگارِ نو کہ باشد سازگار

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست

۳۶۔ ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

آزما ید صاحبِ قلبِ سلیم

۳۷۔ زورِ خود را از مہماتِ عظیم

عشق باد شوار ورزیدن خوش است

۳۸۔ چوں خلیلؑ از شعلہ گل چیدن خوش است

ممکناتِ قوتِ مردانِ کار

۳۹۔ گرد داز مشکل پسندی آشکار

حربۂ دوں ہمتاں کین است و بس

۴۰۔ زندگی را ایں یک آئین است و بس

(ق)

زندگانی قوتِ پیدا ستے

۴۱۔ اصلِ اُو از ذوقِ استیلاستے

عفوِ بیجا سردیٔ خونِ حیات

۴۲۔ سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات

ہر کہ در قعرِ مذلّت ماندہ است

۴۳۔ ناتوانی راقناعت خواندہ است

ناتوانی زندگی را رہزن است

۴۴۔ بطنش از خوف و دروغ آبستن است

از مکارم اندرونِ او تہی است

۴۵۔ شیرش از بہرِ ذمائم فر بہی است

ہوشیار! اے صاحبِ عقلِ سلیم

۴۶۔ در کمینہا می نشیند ایں غنیم

گر خرد مندی فریبِ او مخور

۴۷۔ مثلِ حربا[1] ہر زماں رنگش دگر

شکلِ او اہلِ نظر نشناختند

۴۸۔ پردہ ہا بر روئے او انداختند

گاہ او را رحم و نرمی پردہ دار

۴۹۔ گاہ می پوشد ردائے انکسار

گاہ او مستور در مجبوری است

۵۰۔ گاہ پنہاں در تہِ معذوری است

چہرہ در شکلِ تن آسانی نمود

۵۱۔ دل زدستِ صاحبِ قوّت ربُود

با توانائی صداقت توام است

۵۲۔ گر خود آگاہی ہمیں جامِ جم است

---

[1] حربا: ایک قسم کا جانور جو ہر گھڑی اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔

زندگی کشت است و حاصل قوت است

۵۳۔ شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است
مُدّعی گرمایہ دار از قوت است

۵۴۔ دعویٰ اوبے نیاز از حجّت است
باطل از قوّت پذیرد شانِ حق

۵۵۔ خویش را حق داند از بطلانِ حق
از کُنِ او زہر کوثر می شود

۵۶۔ خیر را گوید شرے شرمی شود
اے زآدابِ امانت بے خبر!

۵۷۔ از دو عالم خویش را بہتر شمر!
از رموزِ زندگی آگاہ شو

۵۸۔ ظالم و جاہل زغیر اللہ شو
چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند

۵۹۔ گرنہ بینی راہِ حق برمن بخند

ترجمہ:

(۱) وہ ہے پہلا مسلمان، شہِ مردانِ خدا یعنی حضرت علی علیہ السلام جن کی

ذات گراں قدر اہلِ عشق کے لیے سرمایۂ ایمان ہے۔

(۲) انھیں کے خاندان کی محبت سے میں زندہ ہوں، اور کائنات میں گوہر کی طرح آبدار و تابندہ ہوں۔

(۳) میں نرگس ہوں اور آپؑ کے نظّارہ کا وارفتہ ہوں اور آپ ہی کے خیابان میں خوشبو کی طرح آوارہ ہوں۔

(۴) میری خاک سے اگر زمزم اُبلتا ہے تو آپ ہی کے فیض سے، اور میری تاک سے شراب الصالحین (شراب طہورہ) ٹپکتی ہے تو آپ ہی کے فیض سے۔

(۵) اگرچہ میں خاک ہوں لیکن آپکی محبت سے آئینہ ہوں۔ میرے سینے سے نکلنے والی آواز اس کی شاہد (گواہ) ہے۔

(۶) آپ کے چہرۂ انور کی جانب دیکھ کر رسول کائناتؐ نے فرمایا تھا کہ ملّتِ اسلامیہ کو آپ کی ذات سے شوکت و حشم حاصل ہوگا۔

(۷) اور رسولؐ پاک نے یہ فرمایا تھا کہ آپ دینِ مبین کی قوت ہیں اور آپ کی آلِ پاک سے دین و دنیا منور اور سنور جائے گی۔

(۸) رسولِ برحقؐ نے آپ کو ابوتراب کا لقب عطا فرمایا اور حق تعالیٰ نے اپنی کتاب (یعنی قرآن) میں ''یدُ اللہ'' کہا ہے۔

(۹) جو شخص بھی زندگی کے رموز سے واقف ہے، وہ حضرت علیؑ کے اسماء کی حقیقت کا بھی راز دان ہے۔

(۱۰) وہ تاریک مٹّی جس کا نام بدن یا جسم ہے اور جس کے ستم و جور کی عقل بھی فریادی ہے۔

(۱۱) جس کے باعث انسان کی آسمان تک پہنچنے والی فکر زمین پیما ہونے پر مجبور ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے آنکھ بے بصر اور کان بہرے ہو جاتے ہیں۔

(۱۲) کیونکہ اس (ہوس) کے ہاتھ میں دو دھاری تلوار ہے اس راہ زن نے مسافروں کے دل توڑے ہیں۔

(۱۳) اسداللہ (شیر خدا) یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے اس خاک کو مُسخّر کیا اور اس کو اکسیر بنا دیا۔

(۱۴) وہ مرتضیٰؑ جن کی تیغ نے حق کو روشن کیا، اس اقلیمِ تن کو فتح کر کے ابوتراب کے لقب سے ملقب ہوئے۔

(۱۵) انسان اپنی کرّاری، شجاعت اور بہادری کے سبب کشور گیر ہوتا ہے اُس کے گوہر کی آبرو خودداری ہے۔

(۱۶) اس کائنات میں جو ابوتراب ہو جاتا ہے وہ آفتاب کو بھی مغرب سے

واپس لوٹا لاتا ہے (یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جب حضرت علیؑ کی نماز کے لئے سورج پلٹا تھا) (یعنی رجعت شمس)

(۱۷) جس نے اس مرکب تن پر مضبوطی سے زین کس لی وہ کرسی سلطنت کے لیے ایسا ہی موزوں ہوتا ہے جیسے انگشتری کے لیے نگینہ۔

(۱۸) اس دنیا میں اس کے پانو کے نیچے خیبر کا شکوہ ہوتا ہے تو عقبیٰ میں اس کا ہاتھ آبِ کوثر کو تقسیم کرنے والا ہوتا ہے۔ (فاتح خیبر حضرت علیؑ اور ساقی کوثر بھی علیؑ ابن ابی طالب)

(۱۹) وہ اپنی معرفتِ ذات کے سبب ید اللّٰہی کرتا ہے اور وصفِ یدُ اللّٰہی سے شہنشاہی کرتا ہے۔

(۲۰) اس (حضرت علیؑ) کی ذات شہر علوم کا دروازہ ہے اور اس کے زیر فرمان حجاز، چین اور روم ہیں (اس میں حدیثِ رسولِ کائنات کی طرف اشارہ ہے ''اَنا مدینة العلم و علی بابها'' ''میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ زیر فرمان حجاز و چین و روم سے مُراد ''مولائے کائنات'' ہیں۔

(۲۱) انسان کو اپنی خاک پر حکمراں ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی ہی تاک سے مئے تاب ناک نوش کر سکے۔

(۲۲) خاک ہو جانا (اپنی ہستی کو مٹا دینا) پروانگی کا مذہب ہے۔ مردانگی اور بہادری تو یہ ہے کہ تو اپنی خاک کا باپ بنے (یعنی ابوترابؑ بنے)

(۲۳) اے پھول کی طرح نازک بدن، پتھر بن۔ تاکہ چمن کے دیوار کی بنیاد بن سکے۔

(۲۴) اپنی مشتِ خاک سے آدمی تعمیر کر، اور پھر آدمی سے ایک کی تعمیر کر۔

(۲۵) اگر تو دیوار و در نہیں بنائے گا تو کوئی دوسرا تیری خاک سے اپنی اینٹ بنائے گا۔

(۲۶) اے فلک ناہنجار کے جور سے پریشان، تیرا دل مصیبتوں کا فریادی ہے۔

(۲۷) یہ فریاد و نالہ، آہ و ماتم کب تلک؟ کب تک یہ مُسلسل سینہ کوبی؟

(۲۸) زندگی کے معنیٰ عمل میں پوشیدہ ہیں۔ تخلیق کی لذّت زندگی کا ایک قانون ہے۔

(۲۹) اُٹھ، اور ایک نئی دنیا کی تخلیق کر، شعلوں کو اپنے پہلو میں لے اور خلیلؑ کہلا۔

(۳۰) نامُساعد حالات سے سمجھوتا کرنا، زندگی کے میدان میں سپر ڈال دینا ہے۔

(۳۱) وہ خوددار آدمی جو پختہ کار ہو، زمانہ خود اس کے مزاج سے سمجھوتا کر لیتا ہے۔

(۳۲) اگر زمانہ اس کے مزاج کے موافق نہیں بنتا تو وہ آسمان تک سے لڑ جاتا ہے۔

(۳۳) وہ موجودات کی بنیاد ہلا دیتا ہے اور عناصر کو ایک نئی ترکیب دیتا ہے۔

(۳۴) وہ (اس تنازع) میں گردشِ ایام تک کو درہم و برہم کر دیتا ہے۔ چرخِ نیلی فام کو توڑ دیتا ہے۔

(۳۵) وہ اپنی قوت سے ایسا جہانِ نو پیدا کرتا ہے جو اس سے سازگار ہو۔

(۳۶) دنیا میں اگر مردانہ وار جینا ناممکن نہ ہو تو مردوں (بہادروں) کی طرح جان دے دینا ہی زندگی ہے۔ (موتٌ فی عِزٍّ خیرٌ من حیاتٍ ذلٍّ)

(۳۷) قلب سلیم رکھنے والا آدمی، عظیم مہمّات کے ذریعہ اپنی قوت کا امتحان کرتا ہے۔

(۳۸) دشواریوں کا مقابلہ کرنے کا جذبہ ہی بہتر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی طرح شعلوں سے پھول چُننا ہی سب سے اچھا ہے۔

Prof. SHARIB RUBAULVI COLLECTION

(۳۹) مردانِ کار وحق آگاہ کی قوت کے امکانات مشکل پسندی ہی سے آشکار ہوتے ہیں۔

(۴۰) کینہ وبغض رکھنا پست ہمتوں کا حربہ ہوتا ہے، اُن کی زندگی کا یہی بس ایک اصول ہوتا ہے۔

(۴۱) زندگی ایک قوتِ آشکار کا نام ہے اور اس کا جوہر غلبہ پا لینے کی خواہش ہے۔

(۴۲) بے جا عفو (معاف) کرنا زندگی کا خون سرد ہو جانے کی علامت ہے اور یہ گویا زندگی کے موزوں شعر میں ایک سکتہ کی طرح ہے (یعنی حرکت وعمل زندگی ہے)

(۴۳) جو کوئی قعرِ مذلّت میں گر جاتا ہے وہ کمزوری کو قناعت کہنے لگتا ہے۔

(۴۴) کمزوری وناتوانی زندگی کی رہزن ہے اس کا پیٹ خوف اور جھوٹ سے بھرا ہوتا ہے۔

(۴۵) اس کا اندرون اعلا صفات سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے دودھ سے مذموم خصائل موٹے تازے ہوتے ہیں۔

(۴۶) اے عقلِ سلیم رکھنے والے ہوشیار، یہ دُشمن تیرے لئے گھاتیں لگائے ہوئے ہیں۔

(۴۷) اگر عقل مند ہے تو اس کے فریب میں نہ آ۔ یہ گرگٹ کی طرح ہر زمانہ میں نیا رنگ بدل لیتا ہے۔

(۴۸) اہلِ نظر، اس کی شکل نہیں پہچانتے (ظاہری نظر رکھنے والے) انھوں نے اس کے مُنھ پر سیکڑوں پردے ڈال دیے ہیں۔

(۴۹) کبھی رحم و نرمی اس کی پردہ دار ہوتی ہے، تو کبھی وہ انکسار کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔

(۵۰) وہ کبھی مجبوری کے پردے میں چھپا ہوتا ہے اور کبھی معذوروں کے پیچھے پوشیدہ۔

(۵۱) جب وہ تن آسانی کی شکل میں اپنا چہرہ عیاں کرتا ہے تو طاقت ور کے ہاتھوں سے بھی دل نکل جاتا ہے۔

(۵۲) توانائی اور صداقت لازم و ملزوم ہیں اگر تو خود آگاہ ہے تو سمجھ لے کہ یہی نکتہ جامِ جم ہے۔

(۵۳) زندگی ایک کھیتی ہے اور قوت اس کا حاصل۔ حق و باطل کے راز کی شرح قوت ہے۔

(۵۴) دشمن اگر طاقت والا ہوتا ہے تو اس کا دعویٰ دلیل سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

(۵۵) قوت کی وجہ سے باطل بھی حق کی سی شان کا حامل ہو جاتا ہے اور حق

کو جھٹلا کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود حق ہے۔

(۵۶) اُس کے ''کُن'' سے زہر بھی کوثر ہو جاتا ہے۔ وہ خیر کو بھی اگر شر کہہ دے تو شر ہی ہو جاتا ہے۔

(۵۷) اے آدابِ امانت سے بے خبر، اپنے آپ کو دو عالم سے بہتر سمجھ۔

(۵۸) زندگی کے رموز سے آگاہی حاصل کر، غیر اللہ کے معاملے میں ظالم و جاہل بن کر رہ۔

(۵۹) اے ہوش مند! اپنی آنکھ، کان اور ہونٹ کھلے رکھ اس کے بعد اگر تُجھے راہِ حق نہ سُجھائی دے تو مجھ پر ہنس۔

☆

''ماخوذ از رموزِ بے خودی''

در معنیٔ حرّیت اسلامیہ و سرِّ حادثۂ کربلا

هر که پیماں با هوالموجود بست
۱- گردنش از بندِ هر معبود رست

مومن از عشق است و عشق از مومن است
۲- عشق را نا ممکنِ ناممکن است

عقل سفّاک است و او سفّاک تر
۳- پاک تر چالاک تر بیباک تر

عقل در پیچاکِ اسباب و علل
۴- عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل

عشق صید از زورِ باز و افگند
۵- عقل مکّار است و دامے می زند

عقل را سرمایه از بیم و شک است
۶- عشق را عزم و یقیں لاینفک است

آں کند تعمیر تا ویراں کند
۷- ایں کند ویراں که آباداں کند

عقل چوں باد است ارزاں در جہاں

۸۔ عشق کمیاب و بہاے اوگراں

عقل محکم از اساسِ چون و چند

۹۔ عشق عریاں از لباسِ چون و چند

عقل میگو ید کہ خود را پیش کن

۱۰۔ عشق گوید امتحانِ خویش کن

عقل با غیر آشنا از اکتساب

۱۱۔ عشق از فضل است و باخود در حساب

عقل گوید شاد شو آباد شو

۱۲۔ عشق گوید بندہ شو آزاد شو

عشق را آرامِ جان حریت است

۱۳۔ ناقہ اش را ساربانِ حریت است

آں شنیدستی کہ ہنگامِ نبرد

۱۴۔ عشق باعقلِ ہوس پرورچہ کرد

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؓ

۱۵۔ سروِ آزادے زبستانِ رسولؐ

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر

۱۶۔ معنیٔ ذبح عظیم آمد پسر[۱]

بہر آں شہزادۂ خیر الملل

۱۷۔ دوشِ ختم المرسلیں نعم الجمل[۲]

سرخ رو عشقِ غیور از خونِ او

۱۸۔ شوخیٔ ایں مصرع از مضمونِ او

درمیانِ امت آں کیواں جناب

۱۹۔ ہمچو حرفِ قُل ھُوَ اللّٰہ در کتاب

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید

۲۰۔ ایں دو قوت از حیات آید پدید

زندہ حق از قوّتِ شبّیری است

۲۱۔ باطل آخر داغِ حسرت میری است

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت

۲۲۔ حریّت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم

۲۳۔ چوں سحابِ قبلہ باراں در قدم

۱۔ وَفَدَینٰاہُ بِذِبحٍ عظیم (آیہ شریفہ)

۲۔ نعم الجمل جملکھا و نعم العدلا نانتما (حدیث)

بر زمینِ کربلا بارید و رفت

۲۴۔ لالہ در ویرانہ ہا کا رید و رفت

تا قیامت قطعِ استبداد کرد

۲۵۔ موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است

۲۶۔ پس بنائے لا الہ گردیدہ است [1]

مدّعا لیش سلطنت بودے اگر

۲۷۔ خود نکر دے باچنیں ساماں سفر

دشمناں چوں ریگِ صحرا لاتعد

۲۸۔ دوستانِ اُو بہ یزداں ہم عدد

سِرِّ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود

۲۹۔ یعنے آں اجمال را تفصیل بود

عزمِ او چوں کوہساراں استوار

۳۰۔ پایدار و تند سیر و کامگار

تیغ بہرِ عزتِ دین است و بس

۳۱۔ مقصدِ او حفظِ آئین است و بس

---

[1] حقّا کہ بنائے لاالٰہ است حسین (خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ)

ماسو اللہ را مسلماں بندہ نیست

۳۲۔ پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد

۳۳۔ ملّتِ خوابیدہ رابیدار کرد

تیغِ لا چوں از میاں بیروں کشید

۳۴۔ ازرگِ اربابِ باطل خوں کشید

نقشِ اِلّااللّٰہ برصحرا نوشت

۳۵۔ سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

رمزِ قرآں از حسینؑ آموختیم

۳۶۔ زآتشِ او شعلہ ہا اند و ختیم

شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت

۳۷۔ سطوتِ غرناطہ ہم ازیاد رفت

تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز

۳۸۔ تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں

۳۹۔ اشکِ مابر خاکِ پاکِ اُورساں

———☆———

ترجمہ:

(۱) جس کسی نے ہوالموجود سے عہد غلامی باندھ لیا اس کی گردن ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہوگئی۔

(۲) مومن عشق کے لئے ہے اور عشق مومن کے لیے ہے۔ عشق کے فیض سے ہمارا ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

(۳) عقل سفّاک ہے۔ مگر عشق اس سے زیادہ سفّاک، پاک، مستعد اور بیباک ہے۔

(۴) عقل اسباب وعلل کے پھندے میں پھنسی رہتی ہے اور عشق میدانِ عمل کا کھلاڑی ہے۔

(۵) عشق اپنے زور بازو سے کمند پھینکتا ہے جب کہ عقل مکّار ہے اور جال پھینکتی ہے۔

(۶) عقل کا سرمایہ اندیشہ وخوف ہے جب کہ عشق کو عزم و یقین سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۷) وہ ویران کرنے کے لیے تعمیر کرتی ہے اور یہ اس لیے ویران وشکست و ریخت کو آباد کرے۔

(۸) عقل دنیا میں ہوا کی طرح ارزاں ہے، جب کہ عشق بہت کمیاب اور

بیش قیمت ہے۔

(۹) عقل کیوں اور کس قدر کی بنیاد پر قائم ہے جب کہ عشق چون و چند (چراں) کے لباس سے بے نیاز ہے۔

(۱۰) عقل کہتی ہے کہ خود کو پیش کر اور عشق کہتا ہے کہ اپنا امتحان کر۔

(۱۱) عقل اکتساب کے ذریعہ اپنے سے غیر آشنا ہو جاتی ہے اور عشق فضلِ خداوندی ہے اور خود احتسابی کرتا ہے۔

(۱۲) عقل کہتی ہے کہ شاد و آباد ہو جا اور عشق کہتا ہے کہ بندگی اختیار کر اور آزاد ہو جا۔

(۱۳) عشق کے لیے حُریّت و آزادی آرامِ جاں ہے اس کے ناقہ کی ساربان (رہبر، رہنما) آزادی ہے۔

(۱۴) کیا تم نے سُنا ہے کہ جنگ میں عشق نے ہوس پرور عقل کے ساتھ کیا کیا؟

(۱۵) عاشقوں کے وہ امام عالی مقام علیہ السلام بتولؑ کے لختِ جگر، رسولِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے باغ کا وہ سروِ آزاد۔

(۱۶) اللہ اللہ! جس کے باپ بسم اللہ کی ''ب'' کا نقطہ ہیں اور ان کے بیٹے حضرت امام حسینؑ آیت ''وما فدیناہُ بذبحٍ عظیم'' کی تعبیر بن کر

آئے۔ اس میں قول مولائے متقیان کی طرف اشارہ ہے۔ ''اَن النقطة تحت الباء ''یعنی پورا قرآن بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہے اور بسم اللہ کے نقطہ ''ب'' میں قرآن ہے اور اس ''ب'' کا جو نقطہ ہے وہ مولا علیؑ کی ذاتِ گراں قدر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت ہے۔

(۱۷) بہترین اُمّت کا وہ شہزادہ یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام جن کے واسطے دوشِ مبارک حضرت ختم المرسلین نعم الجمل یعنی شُتر بنا۔

(۱۸) انھیں کے خون سے غیورِ عشق سرخ رو، کامیاب اور کامران ہے اور اسی مضمون عالی سے اس مصرع میں شوخی ہے۔

(۱۹) وہ بلند مرتبہ ذات یعنی ذات حسین ابن علیؑ، اُمّتِ محمدیہ کے لیے ایسی ہے جیسے کتاب اللہ میں قُل ھو اللہ۔

(۲۰) حضرت موسیٰؑ اور فرعون، حضرت شبیرؑ اور یزید (خیر و شر) کی یہ دو قوتیں ہیں جو اس حیات و کائنات میں دیکھنے میں آئیں۔

(۲۱) قوت شبیریؑ سے تو حق زندہ ہوتا ہے جب کہ باطل کا مقدر حسرت ناک موت کا داغ ہے۔

(۲۲) خلافت نے جب قرآن کریم سے رشتہ توڑ لیا تو حُریّت (آزادی)

میں کام و دہن کو زہر آلود کر دیا۔ یعنی زہر گھول دیا۔

(۲۳) تو بہترین اُمّت کے وہ سرِ جلوہ یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام، قبلہ سے اُٹھنے والی گھٹا، یعنی ابر رحمت کی طرح اپنے جلو میں صداقت لیے ہوئے طلوع ہوئے۔

(۲۴) اور زمین کربلا پر برس گیے اور ویرانوں کو لالہ زار بناتے چلے گئے۔

(۲۵) اور قیامت تک کے لیے ظلم و جور کی جڑیں کاٹ دیں، آپ کی موجِ خون نے (حق پرستی) کا ایک چمن کھلا دیا۔

(۲۶) آپ حق و انصاف کی خاطر، خاک و خون میں لوٹے اور بنائے لاالٰہ بن گئے۔

(۲۷) اگر اس سرفروشی اور ایثار سے آپ کا مقصد حصولِ سلطنت ہوتا تو کیا آپ اسی سامان یعنی بے سروسامانی کے ساتھ سفر کرتے؟

(۲۸) آپ کے دشمن تو صحرا کی ریت کی طرح بے حد و حساب تھے اور دوست یزداں کے ہم عدد یعنی انتہائی قلیل و مختصر لیکن کردار و عمل میں یکتا و یگانہ۔

(۲۹) (بے شک) آپ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ کے خلفِ صادق تھے یعنی قربانی اسماعیلؑ کے اجمال کی تفصیل تھے۔

(۳۰) جن کی عزیمت پہاڑوں کی طرح مستحکم ہے، پائدار ہے، تیز رفتار اور کامیاب تھی۔

(۳۱) حق پرستوں کے نزدیک، تلوار کا کام دین کی عزّت بچانا ہے، ان کا مقصد آئینِ حق کی حفاظت ہے۔

(۳۲) مسلمان اللہ کے سوا کسی کا بندہ نہیں اس کا سر کسی فرعون کے آگے نہیں جھکتا۔

(۳۳) خون حضرت حسین ابن علیؑ نے انھیں اسرارِ دین (رموزِ دین) کی تفسیر پیش کی اور ملّتِ خوابیدہ کو بیدار کر دیا۔

(۳۴) ''لا'' کی تیغ یعنی انکار بیعت کی تیغ جب حضرت امام حسینؑ نے کھینچی تو اربابِ باطل کی رگوں سے اس نے خون کھینچ لیا۔

(۳۵) آپ نے (یعنی حضرت امام حسینؑ) نے اِلاّ اللّٰہ کا نقش صحرائے کربلا پر لکھ دیا اور ہمارے نجات کے عنوان کی سطریں تحریر کر دیں۔

(۳۶) قرآن مجید کے اسرار و رموز ہم نے حضرت امام حسینؑ سے سیکھے اور اُسی کی آگ سے ہم نے کتنے ہی شعلے روشن کیے۔

(۳۷) شام و بغداد کی حکومتوں کی شان و شوکت، کرّ و فر سب جاتی رہی عزناطہ کی حکومت کا دبدبہ ذہنوں سے محو ہو گیا لیکن حضرت امام حسینؑ

کی ذات کی حکمرانی قیامت تک باقی رہے گی۔

(۳۸) لیکن تارِ مضرابِ حُرّیت ضمیر جو امام حسین علیہ السلام نے چھیڑے تھے اس سے آج بھی اور اب تک ہمارے دلوں کے تار لرزاں ہیں اور ان کی صدائے تکبیر سے ہمارا ایمان اب بھی تازہ، زندہ اور پائندہ ہے۔

(۳۹) اے صبا! اے دور افتادوں کی قاصد، ہمارے اشکوں کا ہدیہ حضرت امام حسین علیہ السلام خاکِ پاک تک پہنچا دے۔

☆

''از رموز بے خودی''

در معنی ایں کہ سیّدۃ النساء فاطمۃ الزہراؑ اسوہ کاملہ ایست برائے نساءِ اسلام

مریمؑ از یک نسبتِ عیسےٰؑ عزیز
۱۔ از سہ نسبت حضرتِ زہراؑ عزیز
نورِ چشم رحمۃ العالمینؐ
۲۔ آں امامِ اولین و آخرین
آں کہ جاں در پیکرِ گیتی دمید
۳۔ روزگارِ تازہ آئیں آفرید
بانوے آں تاجدارِ ھَل اَتیٰ
۴۔ مرتضےٰ مشکل کشا شیرِ خدا
پادشاہ و کلبۂ ایوانِ او
۵۔ یک حسام و یک زرہ سامانِ او
مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق
۶۔ مادرِ آں کارواں سالارِ عشق

آں یکے شمعِ شبستانِ حرم

۷۔ حافظِ جمعیتِ خیرُ الامم

تانشیند آتشِ پیکار و کیں

۸۔ پشتِ پازد بر سرِ تاج و نگیں

واں و گر مولائے ابرارِ جہاں

۹۔ قوّتِ بازوئے احرارِ جہاں

درنوائے زندگی سوز از حسینؑ

۱۰۔ اہلِ حق حریت آموز از حسینؑ

سیرتِ فرزندہا از اُمّہات

۱۱۔ جوہر صدق و صفا از اُمّہات

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ

۱۲۔ مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

بہرِ محتاجے دلش آں گونہ سوخت

۱۳۔ بایہودے چادرِ خود را فروخت

نوری وہم آتشی فرمانبرش

۱۴۔ گُم رضایش در رضائے شوہرش

آں ادب پروردۂ صبر و رضا

۱۵۔ آسیا گردان و لب قرآں سرا

گریہ ہائے اُو زبالیں بے نیاز

۱۶۔ گوہر افشاندے بدامانِ نماز

اشکِ اوبر چید جبریل از زمیں

۱۷۔ ہمچو شبنم ریخت بر عرشِ بریں

رشتۂ آئینِ حق زنجیرِ پاست

۱۸۔ پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰؐ است

ورنہ گردِ تربتش گردیدمے

۱۹۔ سجدہ ہابر خاکِ او پا شیدمے

ترجمہ:

(۱) حضرت مریم حضرتِ موسیٰؑ کی والدہ محترمہ ہونے کی نسبت سے مقدس ہیں جب کہ حضرت فاطمہ زہراؑ تین نسبتوں سے مقدّس ہیں۔

(۲) ایک تو آپ اولّین و آخرین کے امام (سردار) رحمۃ العالمین کی نور چشم ہیں۔

(۳) اور آپ پیکر ہستی میں جان کی طرح ہیں۔ آپ کی ذاتِ والا صفات سے زمانہ کو نیا آئین ملا۔

(۴) اور دوسرے تاجدار ہل اتیٰ، حضرت علی مرتضیٰؑ، مشکل کشا اور شیر خدا کی زوجۂ مطہرہ ہیں۔

(۵) مسلمانوں کے امیر ہوتے ہوئے بھی آپ کا بیت الشرف ایک چھوٹا سا گھر (جھونپڑا) اور اثاثہ صرف ایک تلوار اور زرہ تھا۔

(۶) تیسرے، آپ پرکار مرکز عشق اور قافلہ سالارِ عشق یعنی حضرتِ امام حسین علیہ السلام کی والدہ محترمہ ہیں۔

(۷) جو حرم کے شبستان کی شمع اور اُمّتِ محمدیؐ کے اتحاد کے محافظ تھے یعنی حضرت امام حسنؑ علیہ السلام۔

(۸) جنھوں نے بغض اور جنگ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تخت و تاج کو ٹھکرا دیا۔

(۹) اور دوسرے نیکوکاروں کے آقا اور احرارِ عالم کے لیے قوتِ بازو تھے یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام۔

(۱۰) اور جو زندگی کے نغمے کا سوز تھے، اہل حق نے جن سے حُریت کا سبق سیکھا۔

(۱۱) چونکہ اولاد کی سیرت کی تعمیر ماؤں سے ہوتی ہے، انھیں کی بدولت اولاد میں صدق وصفا کا جوہر پیدا ہوتا ہے۔

(۱۲) اور حضرت زہرا (بتولؑ) تعلیم و رضا کی کھیتی کا حاصل تھیں لہٰذا آپ ہر مسلمان کے لیے کامل نمونۂ عمل ہیں۔

(۱۳) آپ کو ایک محتاج پر اتنا ترس آیا کہ اس کو کچھ دینے کے لیے ایک یہودی کو اپنی چادر فروخت فرما دی۔

(۱۴) جنّ و ملائک جن کے تابع فرمان تھے، ان کی رضا اپنے شوہر کی رضا میں گم تھی۔

(۱۵) صبر و رضا کی تربیت یافتہ سیدۃ انساء جن کی زبان مبارک پر قرآن کی آیات اور ہاتھ چکّی پیسنے میں مشغول ہوتے۔

(۱۶) آرام و سکون سے بے نیاز، راتوں کو بارگاہِ الٰہی میں اپنے آنسوؤں کے موتی مُصلّۂ عبادت پر بکھیرتیں۔

(۱۷) وہ جن کے آنسو، رشک گوہر ہیں ان کا یہ مرتبہ کہ جبرئیلِ امینؑ نے انھیں لے جا کر عرش پر شبنم کی طرح بکھیر دیا۔

(۱۸) قرآن حکیم کی تعلیم کا پابند ہوں اور فرمانِ رسولِ کریم کا پاس ہے۔

(۱۹) ورنہ میں حضرت فاطمہ زہراؑ کے مزار اقدس کا طواف کرتا اور آپ کی خاک پر سجدے لٹاتا۔

سپاس جنابِ امیر المومنین علیہ السلام

اب ہم ذیل میں جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبالؔ صاحب مرحوم کی وہ فارسی نظم درج کرتے ہیں جس کے لئے اوپر کی منزلیں بطور تمہید تھیں۔ یہ باقیاتِ اقبال ۱۰۲ تا ۱۰۵ پر اور رختِ سفر ۱۰۰ تا ۱۰۹ پر رسالہ مخزن لاہور جنوری ۱۹۰۵ء سے نقل کی گئی ہے۔ اِس پر ادارتی نوٹ میں مدیر مخزن (جسٹس سر شیخ عبدالقادر مرحوم) نے لکھا۔ فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں۔ تاہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم بہ اظہارِ عقیدت شیخ (محمد اقبال) صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں۔ یہ اقبالؔ کا معمول تھا اور ملّتِ اسلامیہ کا بھلا اسی سیرت پر عمل کرنے سے ہوسکتا ہے۔ اے کاش کہ جمہور اسلام بھی صبح کے وقت اسی طرح یہ سپاس نامہ پڑھا کریں۔ جس طرح علامہ اقبالؔ اپنی کامل عقیدت سے پڑھا کرتے تھے۔

۱۔ اے محو ثنائے تو زبانہا
اے یوسف کاروانِ جانہا
اے بابِ مدینۂ محبت

۲۔ اے نوحِ سفینۂ محبت

اے ماحی نقشِ باطلِ من

۳۔ اے فاتحِ خیبرِ دل من

اے سرِّ خطِ و جوب و امکاں

۴۔ تفسیرِ تو سورہائے قرآں

اے مذہبِ عشق را نمازے

۵۔ اے سینۂ تو امین رازے

اے سرِ نبوتِ محمدؐ

۶۔ اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ

گردوں کہ بہ رفعتِ ایستا دست

۷۔ ازبامِ بلند تو فتا دست

ہر ذرۂ در گہت چو منصور

۸۔ درجوش ترانۂ انا الطور

بے تونتواں بہ اُو رسیدن

۹۔ بے اُونتواں بتو رسیدن

فردوس ز تو چمن در آغوش

۱۰۔ از شانِ تو حیرت آئینہ پوش

جانم بغلامی تو خوشتر

۱۱۔ سر بر زدہ ام زحبیبِ قنبرؓ

ہشیارم و مست بادۂ تو

۱۲۔ چوں سایہ زپا فتادۂ تو

از ہوش شدم مگر بہ ہوشم

۱۳۔ گوئی کہ نُصیریٔ خموشم

دانم کہ ادب بہ ضبط راز است

۱۴۔ در پردۂ خامشی نیاز است

امّا چہ کنم مئے تولّیٰ

۱۵۔ تند است بروں فتد زمینا

ز اندیشۂ عاقبت رہیدم

۱۶۔ جنسِ غم آلِ تو خریدم

(ق)

فکرم چو بہ جستجو قدم زد

۱۷۔ در دَیر شد و در حرم زد

در دشتِ طلب بسے دویدم

۱۸۔ داماں چو گرد باد چیدم

در آبلہ خار ہا خلیدہ

۱۹۔ صد لالہ تہِ قدم دمیدہ
افتادہ گرہ بروے کارم

۲۰۔ شرمندۂ دامنِ غبارم
پویاں پئے خضر سوئے منزل

۲۱۔ بردوشِ خیال بستۂ محمل
جویائے مے و شکستہ جامے

۲۲۔ چوں صبح بہار چیدہ دامے
پیچیدہ بخود چو موج دریا

۲۳۔ آوارہ چو گرد بادِ صحرا
واماندہ ز دردِ نارسیدن

۲۴۔ در آبلۂ شکستہ دامن

(ق)

عشق تو دلم ربود ناگاہ

۲۵۔ از کار گرہ کشود ناگاہ
آگاہِ زہستی و عدم ساخت

۲۶۔ بت خانۂ عقل را حرم ساخت

چوں برق نجر منم گذر کرد

۲۷۔ از لذتِ سوختن خبر کرد

برباد متاع ہستیمٔ داد

۲۸۔ جامے زمئے حقیقتم داد

سرمست شدم زپا فتادم

۲۹۔ چوں عکس زخود جُدا فتادم

پیراہن ''ماومن'' دریدم

۳۰۔ چوں اشک زچشمِ خود چکیدم

خاکم بفرازِ عرش بُردی

۳۱۔ زاں راز کہ بادلم سپردی

واصل بکنار کشتیم شد

۲۳۔ طوفانِ جمال زشتیم شد

جز عشقِ تو حکایتے ندارم

۳۳۔ پروائے ملامتے ندارم

از جلوۂ عام بے نیازم

۳۴۔ سوزم گریم پتم گدازم

☆

ترجمہ:

(۱) اے وہ جس کے لئے (مخلوق خدا) کی زبانین مصروفِ ثناء ہیں۔اے کاروانِ حیات کے یوسف!

(۲) اے مدینۂ محبت کے دروازے!اے سفینۂ محبت کے نوح!

(۳) اے میرے دل کے باطل نقش کو مٹانے والے!اے میرے دل کے خیبر (قلعہ باطل) کے فاتح

(۴) اے وجوب وامکاں (خالق ومخلوق)۔کے خط کی ابتداء! (Starting Point) قرآن کی سورتیں آپ ہی کی تفسیر ہیں۔

(۵) اے وہ جو مذہبِ عشق کے لئے نماز ہے۔اے وہ جس کا سینہ رازِ خداوندی کا امانتدار ہے۔

(۶) اے نبوّت محمدؐ مصطفٰے (لہ ولا لہ الثناء) کے راز! اے وہ جس کی توصیف حقیقت میں محمدؐ رسول اللہ ہی کی ہے۔

(۷) یا علیؑ! آسمان اپنی ساری بلندیوں کے باوجود آپ کے بام بلند کے سامنے جھکا ہوا ہے۔

(۸) آپؑ کی درگاہِ پاک کا ہر ذرّہ خاک انا الحق کہنے والے منصور کی طرح جوش میں انا الطّور میں ہی طور ہوں) کا ترانۂ (مستانہ) گاتا ہے۔

(یاد رہے طور پر تجلّی الٰہی ہوئی تھی)

(۹) آپ کو چھوڑ کر اللہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ نہ ہی خدا کے بغیر آپ تک کسی کی رسائی ہوسکتی ہے۔

(۱۰) جنّت آپ ہی کی وجہ سے ''چمن در آغوش'' یعنی جنّت ہے۔ آپ کی شان کے پرتو سے یاعلیؑ آئینہ ورطۂ حیرت میں گم ہے۔

(۱۱) یاعلیؑ میری جان آپؐ کی غلامی میں نہایت خوش وخرم ہے۔ میں آپؑ کے غلام بے دام قنبرؑ کا ہم گریباں ہوں۔

(۱۲) (ہاں! ہاں!) میں ہوش میں ہوں اور آپؑ کی محبت کے نشہ میں مست (مدہوش) ہوں۔ سرمستی کے عالم میں سایہ صفت آپؑ کے پاؤں تلے ہوں۔

(۱۳) (تم سمجھتے ہو شاید) میں ہوش کھو بیٹھا ہوں۔ میں اتنے ہوش میں ہوں کہ اگر تم کہو میں نصیری ہوگیا ہوں تو بھی میں خاموش رہوں گا۔

(۱۴) میں جانتا ہوں کہ ضبط راز ہی ادبِ محبت ہے اور نیاز خاموشی ہی کے پردے میں ہے۔

(۱۵) لیکن میں کیا کروں کہ مئے تولائے علیؑ اتنی تند ہے کہ مینا باہر ہوئی جاتی ہے (چھپائے نہیں چھپتی لبوں پر آ آجاتی ہے)

(۱۶) اب میں اندیشۂ عاقبت سے آزاد ہوں کیونکہ میں نے آپ کی آلِ اطہار کے غم کو خرید لیا ہے۔

(۱۷) میری فکر نے جب جستجو کے لئے قدم اُٹھائے تو جو قدم دَیر میں تھا وہ حرم میں جا پڑا۔ (اسکی روئیداد کچھ یوں ہے)

(۱۸) دشتِ طلب میں میں بہت بھاگا دوڑا۔ اپنے دامن کو بگولے کی طرح سمیٹتا رہا۔

(۱۹) میرے پائے جستجو کے چھالوں میں کتنے ہی کانٹے کھٹکے اور میرے قدم کے نیچے سینکڑوں گل لالہ اُگے (یعنی پر خار وادی میرے پاؤں کے خون سے رنگین ہو کر خارزار سے لالہ زار بن گئی)

(۲۰) میری حاجتوں میں گرہ پڑی رہی۔ اپنے غبار کے دامن میں شرمسار رہا۔

(۲۱) منزل کی جانب خضر کی تلاش میں میں (دُھن اور لگن سے) دوڑا پھرتا رہا۔ دوش پر اپنی خیال کی محمل کو اٹھائے ہوئے۔

(۲۲) میں جویائے مئے (معرفت) رہا۔ اپنے جام شکست کے ساتھ۔ صبح بہار کے چنے ہوئے چرندے کی مانند (گویا فضائے چراگاہ میں چرندے کی طرح پھرتا رہا اور چنا کیا۔

(۲۳) سمندر کی موج کی طرح اپنے ہی آپ میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔
بیاباں کے بگولے کی طرح میں چکر کھاتا رہا (دَر دَر میں گھومتا بھی رہا
اور بلندی کی طرف اُٹھتا بھی رہا)

(۲۴) منزل تک نارسائی کے صدمے اور پاؤں کے چھالوں کے پھٹ
جانے سے میں شکستہ حال رہا۔

(۲۵) یا علیؑ! آپ کے عشق نے یکا یک میرے دل پر چھاپہ مارا اور ناگاہ
میری عقدہ کشائی فرمائی۔

(۲۶) آپؑ کے عشق نے ہستی و عدم سے آگاہ کر دیا اور میری عقل و فکر کے
بُت خانہ کو حرم (الٰہی) بنا دیا۔

(۲۷) آپؑ کا عشق میرے خرمن ہستی پر سے بجلی کی طرح گزرا اور جلنے کی
لذّت سے مجھے آشنا کر گیا۔

(۲۸) آپؑ کا عشق میری متاع ہستی کو برباد کر گیا مگر مجھے مئے حقیقت کے
جام عطا کر گیا (میں خود کو تو کھو بیٹھا مگر خدا کو پا گیا۔)

(۲۹) میں اس عشق سے سرمست ہو کر گر پڑا ہوں گویا سایہ کی طرح پیکر سے
الگ ہو کر زمین پہ جا پڑا ہوں۔

(۳۰) ''پیراہنِ ما و من'' کو میں نے چاک کر ڈالا ہے۔ (یعنی اپنی ہستی اور

دوسروں کی ہستی کے امتیاز کو مٹا دیتا ہے۔آنسو کی مانند میں خود اپنی آنکھوں سے ٹپک پڑا ہوں۔)

(۳۱) آپ نے جو راز میرے دل کے سپرد کیا اسی نے میری خاک کو عرش کی بلندی تک پہنچا دیا۔

(۳۲) میری کشتی کنارے لگ گئی اور میری بدصورتی طوفانِ حسن و جمال بن گئی۔

(۳۳) یا علیؑ! آپ کے عشق کی حکایت کے سوا میرے پاس اور ہے بھی کیا؟ میں اس میں کسی ملامت کی کوئی پرواہ نہیں رکھتا۔

(۳۴) میں جلوۂ عام سے بے نیاز ہوں۔ میں جل رہا ہوں گریاں ہوں۔ تب و تاب و اضطراب میں مبتلا ہوں اور گھل رہا ہوں۔

''اقبالؔ کے اردو کلام میں اہلِ بیت علیہم السلام سے عقیدت''

باقیات اقبال ص ۸۴ پر اقبالؔ نے عقیدت کے پھول دربار آل محمدؐ میں یوں پیش کئے ہیں:

واسطہ دوں گا اگر لخت دل زہراؑ کا میں
غم میں کیونکر چھوڑ دیں گے شافع محشر مجھے
رونے والا ہوں شہیدؑ کربلا کے غم میں میں
کیا دُر مقصد نہ دیں گے ساقیٔ کوثرؑ مجھے
دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشق اہلبیتؑ
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِّ دامنِ حیدرؑ مجھے

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدریؑ

جس طرح مجھ کو شہیدؑ کربلا سے پیار ہے
حق تعالےٰ کو یتیموں کی دُعا سے پیار ہے

فیض اقبالؔ ہے اِسی در کا
بندۂ شاہ لافتیٰ ہوں میں

سینۂ پاک علیؑ جن کا امانت دار تھا
اے شہ ذی جاہ تو واقف ہے ان اسرار کا

یہ ہے اقبالؔ فیضِ یادِ نام مرتضیٰؑ جس سے
نگاہ فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے

کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبالؔ
مرید پیرِ نجف ہے غلام ہے تیرا

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بو ذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادر زہراؑ

رختِ سفر میں ص ۳۰ پر یہ اشعار ہیں جو باقیات اقبالؔ میں نہیں پائے جاتے۔

نجف میرا مدینہ ہے مدینہ ہے مرا کعبہ
میں بندہ اور کا ہوں امتِ شاہؑ ولایت ہوں

جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو
مجھے معذور رکھ میں مستِ صہبائے محبت ہوں

یہی صہبا ہے جو رفعت بنا دیتی ہے پستی کو
اسی صہبا میں آنکھیں دیکھتی ہیں راز ہستی کو

جسے نانِ جویں بخشی ہے تونے
اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر
غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہیں اسماعیلؑ

ع نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؓ

یہ صرف ایک مختصر اور طائرانہ نظر انتخاب ہے ورنہ اردو کلام سے بھی بہت سے اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاسکتے ہیں۔

غالبؔ و اقبالؔ میں مماثلت

مدحت شاہ ولایت کے سلسلے میں غالبؔ و اقبالؔ کا تقابلی مطالعہ پیش خدمت ہے۔ غالبؔ نے حضرت علیؑ کے لئے فرمایا

''فیض سے یہ تیرے ہے اے شمع شبستانِ بہار''

اقبالؔ نے امام حسنؑ کے لئے فرمایا ''آں یکے شمع شبستانِ حرم''

	غالبؔ	اقبالؔ
۱۔	ہو وہ سرمایہ ایجاد جہاں گرم خرام ہر کفِ خاک ہو واں گردۂ تصویر زمیں سرمایۂ ایجاد عالم حضرت علیؑ جہاں سر گرم خرام ہوں وہاں کی ہر مشت خاک کرۂ زمین بن جاتی ہے۔	اے سرّ خطِ وجوب و امکاں تفسیر تو سو رہائے قرآں
۲۔	ہم عبادت کو تیرا نقشِ قدم مُہر نماز ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استظہار	اے مذہب عشق را نمازے اے سینۂ تو امین رازے
۳۔	مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعت نبی جام سے تیرے عیاں بادۂ جوش اسرار	اے سِرِّ نبوّت محمدؐ اے وصف تو مدحت محمدؐ

۴۔ **ابوتراب**

نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے　　گردوں کہ بہ رفعت ایستادست
ابداً پشتِ فلک خم شدہ طرز زمیں　　ازبام بلند تو فتادست

آپ کے نام ابوتراب کی وجہ سے زمیں
(تراب) کا یہ رتبہ ہو گیا کہ اس کے
سامنے آسمان کی کمر ہمیشہ کے لئے خم
رہے گی۔

۵۔ **نجف**

ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینہ ناز　　ہر ذرہ در گہت چو منصور
گرد اس دشت کی امید کو احرام بہار　　در جوش ترانۂ انا الطور

صحرائے نجف کا ہر ذرہ خورشید کے لئے
آئینہ ناز ہے۔ نجف پاک کی خاک کا
ذرہ امید کے لئے فصل بہار کا جامۂ
احرام ہے۔

۶۔ تیری اولاد کے غم سے ہے ابروئے گردوں　　ز اندیشہ عاقبت رہیدم
سلکِ اختر میں مہ نو مثرۂ گوہر بار　　جنسِ غم آلِ تو خریدم

۷۔ کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا　　فردوس ز تو چمن در آغوش
کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں　　از شانِ تو حیرت آئینہ پوش

۸۔ کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے آگاہ ز ہستی و عدم ساخت
رنگ عاشق کی طرح رونق بُت خانۂ چیں بت خانۂ عقل را حرم ساخت

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں معتبر و مستند شعراء کے علوئے فکر کا اندازہ اس تقابلی مطالعہ سے آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

اقبالؔ کے عقائد مذہبی پر ناپختہ ذہن واعظوں نے جو اعتراض کیے اور حدیثِ رسول کائنات ''لحمك لحمی و دمّك دمّی'' کے ذیل میں اقبالؔ کی توضیح پر جو انگشت نمائیاں کی گئیں اس کے ذیل میں اقبالؔ کا نقطۂ نظر بھی ملاحظہ فرمائیں:

''واعظین کی حالت''

باقیات اقبالؔ ص ۶۶ پر علامہ نے واعظین کی حالت کی یوں تصویر کشی کی ہے۔

واعظوں میں یہ تکبّر کہ الٰہی توبہ
اپنی ہر بات کو آواز خدا کہتے ہیں
ان کے ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا
ہاں مگر وعظ میں دنیا کو بُرا کہتے ہیں

فرقہ بندی کی ہوا تیرے گلستاں میں چلی
یہ وہ ناداں ہیں اسے بادِ صبا کہتے ہیں

آہ جس بات سے ہو فتنۂ محشر پیدا
یہ وہ بندے ہیں اسے فتنہ رُبا کہتے ہیں

خانہ جنّلی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں
مرض الموت ہے جو اُس کو دوا کہتے ہیں

مقصد لحمک لحمی پہ کھلی ان کی زباں
یہ تو اک راہ سے تجھ کو بھی بُرا کہتے ہیں

تیرے پیاروں کا تو یہ حال ہے اے شافعِ حشرؐ
میرے جیسوں کو تو کیا جانئے کیا کہتے ہیں

درج بالا عنوان سے اقبالؔ کے عشق اہلِ بیت میں سرشاری اور والہانہ پن کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہی اقبالؔ کے افکار و نظریات کی اساس اور سرچشمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس میں کسی طرح کی بحث اور چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

———☆———

غمِ شہیدِ کربلا دُرِ مقصود اقبالؔ

ہمارے اردو زبان وادب کے طویل منظر نامے میں دو شاعر انیسؔ اور اقبالؔ ایسے ہوئے ہیں جن کی علمی وادبی اہمیت کے ساتھ مذہبی قدر و قیمت بھی ہمیشہ سے مسلم الثبوت رہی ہے بالخصوص اقبالؔ برصغیر ہندو پاک کے فرزندانِ توحید کے لئے بڑی دل کشی اور فکر انگیزی کا سبب بنے رہے ہیں۔ کلام اقبالؔ کی مختلف جہتیں ہمیشہ سے علمی وادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ دینی حلقوں میں بھی اپنی جلوہ گری سے نگاہوں کو تجلیاں بخشتی رہی ہیں۔ اہل علم وبصیرت کے لئے کلام اقبالؔ میں ایسے فکری، علمی اور دینی واضح اشارے ملتے ہیں جو دنیائے اسلام کو دعوت فکر ونظر عطا کرتے ہیں اور جو ایک طرح سے دائمی دعوتِ حق ہیں۔

عشقِ اہلِ بیت رسولؐ، اقبالؔ کے کلام کا فکری تخلیقی اور فکری سرچشمہ ہے۔ درج ذیل اشعار سے اقبالؔ کے مسلک اور عقیدے کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

رونے والا ہوں شہیدِ کربلا کے غم میں میں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقیٔ کوثر مجھے

واسطہ دوں گا اگر لختِ دلِ زہراؑ کا میں
غم میں کیوں کر چھوڑ دیں گے شافعِ محشر مجھے
ہوں مرید خاندانِ خفتۂ خاکِ نجف
موجِ دریا آپ لے جائے گی ساحل پر مجھے
دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشقِ اہلبیتؑ
ڈھونڈھتا پھرتا ہے ظلِ دامنِ حیدرؑ مجھے

درج بالا اشعار ماہنامہ مخزن لاہور ستمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئے تھے اس کے بعد 'باقیاتِ اقبال' اشاعت اول و دوم ص ۲، ۱۷، ۳، ۱۷ امیں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

سپاس جنابِ امیر علیہ اسلام' جسے مدیر مخزن لاہور جسٹس سر شیخ عبدالقادر نے اس ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں تاہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم بہ اظہار عقیدت شیخ (محمد اقبال) صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں'' [1] [2]

---

[1] رسالہ مخزن لاہور جنوری ۱۹۰۵ء باقیات اقبال، ص ۱۰۲ اص ۱۰۵

[2] نظم اس ادارتی نوٹ کے ساتھ اقبال کے حیات میں شائع ہوئی تھی

درج بالا نظم کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے:

اے محو ثنائے تو زباں ہا

اے یوسفِ کاروان جاں ہا

ترجمہ: اے وہ (علیؑ) جس کے لئے (مخلوقِ خدا) کی زبانیں مصروفِ ثنا ہیں۔ اے کاروانِ حیات کے یوسف۔

اور اس کا درج ذیل شعر مرکزی حیثیت رکھتا ہے:

زاندیشۂ عاقبت رہیدم

جنس غم آل تو خریدم

ترجمہ: اب میں اندیشہ عاقبت سے آزاد ہوں کیونکہ میں نے آپ کی آل اطہار کے غم کو خرید لیا ہے۔

درج ذیل بالا اشعار کی روشنی میں اقبالؔ کی معرفت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ غم آلِ محمد کو نجات اخروی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور عزائے شہید کربلا کو حصول دُر مقصود سمجھتے تھے۔

واضح رہے کہ شاعری واردات قبیلہ اور دلی جذبات کے اظہار کا موثر ترین پیرایہ ہے۔ اقبالؔ کے درج بالا اشعار کی روشنی میں ان کے عقیدہ وعمل کے درج ذیل پہلو کھل کر بروئے کار آتے ہیں۔

یعنی حضرت ختم المرسلین کے نواسے، لختِ دل زہراؑ حضرت امام حسینؑ کا واسطہ اور وسیلہ دینے سے دُر مقصود حاصل ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ خفتہ خاک نجف یعنی حضرت امیر المومنین علی ابن طالب علیہ السلام کے خانوادے کا اقبالؔ مرید تھا اور اپنے کو موجِ دریا میں پھنسا ہوا سمجھتا تھا اور ساحل کی تلاش میں تھا وہ کسی اور کا مرید نہیں تھا بلکہ حضرت امام المتقیان کے خانوادے کے سامنے سر تسلیم خم کرتا تھا اور اس تسلیم کو ہی اپنے لئے ذریعہ نجات تصور کرتا تھا۔ اقبالؔ وحدت پرست تھا اور اسلام میں سوائے محمد و آل محمد کے ان کے منازل و مراتب کے باعث وہ کسی دوسرے کے سامنے سپردگی اختیار نہیں کرتا تھا۔ اقبالؔ کے سینہ میں 'داغ عشق اہلبیت' تھا اور وہ دامن حیدرؑ کرار میں ہی پناہ گزیں تھا۔ اس ذیل میں اقبالؔ کا درج ذیل شعر بھی توجہ طلب ہیں:

جس طرح مجھ کو شہید کربلا سے پیار ہے
حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

باقیات اقبالؔ، ص ۵۷

''رموز بے خودی'' میں اقبالؔ در معنی حُریت اسلامیہ و حادثۂ کربلا کے تحت رقم طراز ہیں:

Prof. SHARIB RUDAULVI COLLECTION

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؓ

۱۔ سرد آزاد زبستانِ رسولؐ

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر

۲۔ معنئ ذبح عظیم آمد پسر

درمیان امت آں کیواں جناب

۳۔ ہم چو حرف قل ہواللہ در کتاب

موسیٰ وفرعون وشبیرؑ ویزید

۴۔ ایں دوقوت از حیات آمد پدید

زندہ حق از قوتِ شبیری است

۵۔ باطل آخر داغ حسرت میری است

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت

۶۔ حریت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سرجلوۂ خیرالامم

۷۔ چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

برزمین کربلا بارید و رفت

۸۔ لالہ درویرانہ ہا کارید و رفت

تاقیامت قطع استبداد کرد

۹۔ موج خونِ او چمن ایجاد کرو

خون اوتفسیر ایں اسرار کرو

۱۰۔ ملت خوابیدہ رابیدار کرو

اے صبا! اے پیک دور افتاد گان

۱۱۔ اشک مابر خاک پاک اور ساں

ترجمہ:

۱۔ عاشقوں کے وہ امام بتول کے لخت جگر رسول اکرم کے باغ کاوہ سرد آزاد یعنی امام عالی مقام حضرت حسین علیہ السلام۔

۲۔ اللہ اللہ جس کا پدر بزرگوار بسم اللہ کی 'ب' کا نقطہ ہے اور ان کے پسر محترم یعنی حضرت امام حسینؑ 'ذبح عظیم' کے معنی بن کر نمودار ہوئے۔

۳۔ وہ بلند مرتبہ ذات اُمت محمدیہ کے لئے ایسی ہے جیسے کتاب اللہ میں سورۃ قل ہواللہ۔

۴۔ موسیٰ وفرعون شبیرؑ ویزید (خیروشر) کی یہ دوقوتیں ہیں جو زندگی میں دیکھنے میں آئیں۔

۵۔ قوت شبیری سے حق زندہ ہے اور باطل کا مقدر حسرت ناک موت کا داغ ہے۔

۶۔ خلافت نے جب قرآن سے رشتہ توڑلیا تو حریت میں کام ودہن کو زہرآلود کردیا۔

۷۔ تو بہترین اُمت کے وہ سرجلوہ یعنی حضرت امام حسینؑ قبلہ سے اٹھنے والی گھٹا اپنے جلو میں صداقت کی بارش لئے ہوئے نمایاں ہوئے۔

۸۔ اور زمین کربلا پر برس گئے اور ویرانوں میں لالہ زاری کرتے چلے گئے۔

۹۔ اور قیامت تک کے لئے ظلم وجبر کی جڑ کاٹ دی آپ کی موج خون نے (حق پرستی) کے چمن کھلا دئے۔

۱۰۔ خون حسین علیہ السلام نے انھیں اسرار دین کی تفسیر پیش کی اور خوابیدہ ملت کو پیدا کر دیا۔

۱۱۔ اے صبا، اے دور افتادوں کی قاصد ہمارے اشکوں کا ہدیہ ان کی خاک پاک تک پہونچا۔

یہ حصہ ۳۹۔ اشعار پر مشتمل ہے میں نے طوالت کے باعث صرف گیارہ اشعار کا انتخاب وترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

علامہ اقبالؔ کی اس اشک افشانی کے جذبۂ عقیدہ وعمل کے بعد اب کوئی لوگوں سے پوچھے کہ آخر تم کیوں زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے؟ کیا علامہ اقبالؔ سے زیادہ تمھاری فہم وبصیرت ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی مرد مُسلِم اور مرد مُسلم ہی کیا کوئی بھی صحیح الدماغ علامہ اقبالؔ کے مقابلے میں کسی شاعر کو اہمیت نہیں دے گا۔ علامہ اقبالؔ فخر مشرق، شاعر مشرق اور حکیم الامت کے نام سے پوری دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ غم ہمیشہ نیک اعمالوں اور نیکوکاروں کے لئے ہوتا ہے نہ کہ بداعمالوں کے لئے۔ قرآن مجید کی آیت واضح اعلان کر رہی ہے:

فما بکت علیھم السماء والارض وما کانو منظرین

یہ آیت اس سیاق وسباق میں ہے کہ جب فرعون اور اس کا لشکر غرق

ہو گیا تب ارشاد ہوا۔

ترجمہ: نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین نے گریہ کیا اور نہ انھیں اللہ کی طرف سے مہلت دی گئی۔

اس سے قرآنی استدلال یہ ہوا کہ بداعمالی کا تقاضا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر غم نہ کیا جائے اس کے برخلاف جو حسن عمل رکھنے والے ہوں وہی مستحق غم و ماتم ہیں اب جو جتنا بلند کردار بلند مراتب جتنا مرکز فیوض و برکات دنیا سے رخصت ہوگا تو اس کا غم و ماتم بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

یہ وہ مسلم حقیقت ہے کہ شہدائے کرام کے زندۂ جاوید ہونے کا علم ہم کو قرآن مجید اور رسول کائنات سے ملا ہے۔ قرآن مجید کے پارہ سیقول کی آیت تو مسلمانوں کو یاد ہوگی جس میں ارشاد ربانی ہے کہ شہیدانِ راہ خدا زندۂ جاوید ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو بلکہ اپنے پروردگار کی طرف سے رزق پاتے ہیں۔

اور اب عمل رسولؐ تاریخ اسلام کی روشنی میں ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی شہادت پر خود رسولؐ اسلام نے آنسو بہائے ہیں۔ واضح رہے کہ سنت وہی ہے جو عمل رسولؐ میں ہو اور بدعت وہ ہے جو رسول اسلام کے عمل کے خلاف ہو۔ اگر حضرت حمزہ کی شہادت پر رسولؐ ہنسے

ہوتے تو رونا بدعت ہوتا لیکن رسول کائناتؐ نے غم وگریہ کیا ہے تو پھر خوشیاں منانا ہی بدعت ہوگا۔ اس ذیل میں تاریخ کا فقرہ ہے۔

یبکیٰ کلمابکت صفیة ومنشج کلماشجت صفیه۔

یعنی جتنا صفیہ خواہر حمزہ روتی تھیں اتنا اتنا رسول کائناتؐ گریہ فرماتے تھے۔ نشج کے معنی عربی میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جانے کے ہیں۔

حضرت جعفر طیار بھی شہید ہوئے۔ جنگ موتہ میں ان کے دونوں ہاتھ قلم ہوئے۔ رسولِ اسلام نے منبر پر خطبہ میں ان کی خبرِ شہادت سنائی اور یہ خبر خانۂ خاتون جنت میں پہنچی جب خانۂ خاتون جنت میں رسول کائناتؐ تشریف لے گئے تو حضرت فاطمہؑ کو گریہ کناں دیکھا۔ رسولؐ نے فرمایا۔

علیٰ مثل جعفر فلتبك البوا۔

یعنی جعفر ایسے پر رونے والیوں کو رونا ہی چاہیئے۔

پیغمبر کائنات نے 'علیٰ مثل جعفر' کہہ کر ایک اصول ومعیار بنا دیا کہ ہر وہ شخص جو حسن عمل کا مالک ہے اور شہید راہ خدا ہے اس پر غم وماتم وگریہ عمل صالح ہے۔ اب کس مسلمان میں یہ ہمّت ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرے اس کی مخالفت کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج متصور ہوگا۔

بہر کیف آج کی اس دنیا میں جبکہ نظریات کا اژدہام ہے عالم اسلام

میں بھی نت نئی تحریکیں جنم لیتی جارہی ہیں اور ماہ محرم کا چاند آسمان نیل فام پر نمودار ہوتے ہی بھانت بھانت کے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگتی ہے انھیں علامہ اقبالؔ کے نظریۂ غم محمدؐ اور آل محمد کو دیکھنا سمجھنا اور برتنا چاہیئے تاکہ حقیقت غم حسینؑ سمجھ میں آسکے اور ملت اسلامیہ ٹھوس اور اٹل حقیقت سے اپنی زندگی اور عاقبت کو سنوار سکے بقول اقبالؔ:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیریؑ
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی وشامی

اقبالؔ اور جمہوریت

جمہوریت کی توضیح، تشریح، تصریح اور توجیہ کے مختلف انداز اور معیار اپنائے جارہے ہیں۔ ابراہم لنکن نے اسے عوام کے لیے، عوام کے ذریعہ اور عوام کی حکومت بتایا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں سرمایہ داروں، جاگیرداروں، امیروں اور سلطانوں کا تسلط عوام پر نہیں رہتا ہے، جس میں جبر وتشدد کا دخل نہ ہو۔ یہ طرز یونان اور اتھینز کی حکومت میں بھی اربابِ سیاست تلاش کر لیتے ہیں۔ گوکہ ان کے تضادات کا بھی اقرار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسپارٹا کی طرزِ حکومت پر عسکری نظام کا غلبہ تھا جس کے نتیجے میں فاشزم کی جھلکیاں دکھائی پڑتی ہیں۔ روم میں بھی نام نہاد جمہوریت کا ذکر ملتا ہے جہاں عوامی امتیازات کی بنا پر قانون ساز مجلس میں دولتمند اور اہلِ ثروت خاندانوں نے اکثریت حاصل کر لی اور شہنشاہیت وآمریت کا عمل دخل شروع ہوگیا۔

اقبالؔ اسلامی طرزِ جمہوریت کے حامی ہیں اور اصل میں اسلام کسی نظامِ حکومت کا نام نہیں بلکہ نظامِ زندگی کا نام ہے اور یہ نظامِ زندگی جمہوری مزاج کا امانت دار ہے۔ اس کی ترتیب عوامی احکامات، آراء اور مشوروں پر نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں صرف احکاماتِ الٰہیہ اور سیرت سرورِ کائنات کو

بنیاد بنایا جاتا رہا ہے، لہٰذا احکاماتِ خداوندی اور طریقِ عمل محمدی کو ہی اسلامی جمہوریت کا نام دیا جا سکتا ہے جس میں جبر و تشدّد، سفاکیت اور بربریت کو دخل نہیں۔ برتری کا معیار چوں کہ دولت و حکومت، تخت و تاج نہیں بلکہ کردار کی بلندی اور تقویٰ ہے جس سے مساوات اور اخوت کا اہم پہلو بروئے کار آیا۔ اس کے نتیجے میں شہنشاہیت، آمریت اور مادّی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اسلامی نظامِ زندگی نے جو اخوت و مساوات کا درس دیا، اس کو اسلامی جمہوری نظام بجا طور پر قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ تفریق مذہب و ملت، امتیاز رنگ و نسل باطل ٹھہرائے گئے۔ مغربی جمہوریت میں بہر طور جاگیردارانہ نظامِ حکومت کا اثر تھا، وہاں کی شہنشاہیت کو عوامی بیداری نے اکھاڑ پھینکا لیکن اس کا فائدہ وہاں کے تاجروں نے اٹھایا۔ سرمایہ داروں نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ صنعتی انقلاب کا دور دورہ رہا اور سرمایہ داروں نے دولت کو جمع کرنے میں انتہا کر دی۔ یورپ میں پارلیمانی حکومت کا قیام عمل میں آیا مگر اس میں جنگ چلتی رہی۔ عوامی زندگی کے مالک افراد کو منتخب ہو کر ان ایوانوں میں پہنچنا دشوار ہو گیا۔ علمی استعداد اخلاقی بلندی کا کوئی مقام نہیں رہا۔ گھوم پھر کر سرمایہ داری ہی کا بول بالا رہا کیوں کہ سارے ترسیل و ابلاغ کے ذرائع زر و دولت والوں کے پاس ہی محفوظ تھے اسی وجہ سے علامہ اقبالؔ اس طرح کے اندازِ جمہوریت کے شدید مخالف تھے۔ ان کے نزدیک

وہ جمہوریت ایک فریب ہے جس میں ملوکیت کی شمولیت ہو۔

در اصل علامہ اقبالؔ اسلامی جمہوریت میں یقین رکھتے تھے اور مغرب کی جمہوریت کو فریب تصور کرتے ہیں۔ جزوی طور پر وہ اشتراکیت کے بھی حامی ہیں لیکن لادینیت کو پسند نہیں کرتے۔ وہ دینی زندگی اور حیاتِ مذہبی کو برتری دیتے ہیں۔ ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادّہ پرستی کے شدید مخالف ہیں۔ اقبالؔ اسلامی جمہوریت کے بنیادی اصولوں پر زور دیتے ہیں اور فرد پر فرد کی حکومت کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو چاہے آمریت ہو یا مطلق العنانیت کی کوئی شکل یا شخصی حکومت کا کوئی روپ ہو یا جمہوری انداز کی کوئی بھی حکومت۔ دراصل یہ سب کے سب اندازِ جہاں بانی اور امورِ حکمرانی کے بدلے ہوئے نام ہیں۔ تاریخ میں ایسا بھی ہوا ہے جب اشتراکیت اور سماج واد میں یقین رکھنے والوں نے جمہوریت کے خلاف تحریک چلائی ہے اور غریب عوام اس تحریک کے فریب کا شکار ہوئے ہیں۔ مسولینی اور ہٹلر اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ان الوگوں نے عوام میں یہ بات پہنچائی کہ جمہوریت ایک پُرفریب حکومت ہے اس بات کو تیزی کے ساتھ پھیلایا گیا۔ ان لوگوں نے اپنے نقطۂ نظر کو عام کرنے کے لیے زبردست کوششیں کیں اور نتیجے کے طور پر مجلس قانون ساز میں ایک بحران نمودار ہوا اور فاشزم کو فروغ حاصل ہوا۔ مسولینی اور ہٹلر فاشزم کے علمبردار بنے اور اپنی

آمریت کو جمہوریت کا نام دینے لگے۔ اقبالؔ نے اس طرز کے حکمرانوں کو ''جمہور کا ابلیس'' کہا ہے:

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

اقبالؔ نے اپنی شاعری میں اس جمہوریت کی مخالفت کی ہے جو حکومت کے جذبے کو فروغ دیتی ہے کیوں کہ اسلام میں حکومت کا تصور ہی نہیں ہے۔ حکومت کے لیے فوج اور خزانے کی ضروت ہوتی ہے لیکن حیاتِ طیبہ سرورِ کائناتؐ میں کوئی فوج اور لشکر نہیں تھا ہاں! جب ضرورت پڑتی تھی تو گلدستۂ اذان سے اعلان ہو جاتا تھا لوگ گھروں سے تلواریں لے کر جہاد کے لیے آ جاتے تھے، ان کو جنگ کے میدان میں بھی یہ حکم تھا کہ جو میدانِ کارزار سے بھاگ رہا ہو اس کا تعاقب نہ کیا جائے کیوں کہ جو میدانِ کارزار سے راہِ فرار اختیار کر رہا ہے وہ تو خود ہی حیات کی بھیک مانگ رہا ہے لہٰذا اس کے سوال کو رد کرنا اسلامی نظامِ زندگی نہیں۔ میدانِ جنگ میں اگر مخالف کے پاس ہتھیار نہیں ہے تو جب تک اس کو اسی معیار کا اسلحہ نہ فراہم کیا جائے جنگ نہیں ہو سکتی۔ یہ جمہوری اندازِ فکر و عمل ہے۔ حکومت کے قیام کے لیے خزانہ ضروری ہے مگر حیاتِ سرورِ کائنات میں کوئی خزانے کا تصور نہیں۔ ہاں! بیت المال ہے مگر اس کی نوعیت یہ ہے کہ چراغ جلنے سے پہلے اس میں جھاڑو

پھیر دی جاتی ہے۔ ایک دانہ بھی باقی نہ رہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مالِ غنیمت کچھ بچ جاتا تو اس کو کسی امین کے پاس بطور امانت رکھ دیا جاتا۔ تا کہ ذخیرہ اندوزی اور سرمایہ داری کا رجحان نہ پیدا ہو سکے۔ لہٰذا اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ سرورِ کائنات کی حیاتِ مبارکہ میں حکومت کا تصور ہی نہیں تھا، لہٰذا اقبالؔ جمہوری نظامِ زندگی میں یقین رکھتے ہیں مگر حکومت کے لفظ اور تصور سے متنفر ہیں اور اپنی شاعری میں متعدد مقامات پر مختلف انداز میں اس پر تبصرہ فرماتے ہیں۔

جمہوری اندازِ حکومت اور طرزِ حکمرانی کو اقبالؔ نے کبھی بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا، اس لیے کہ اس طرزِ حکومت میں بھی عوام کی نمائندگی نہیں ہو پاتی۔ لیاقت، صلاحیت، اخلاقی رفعت، علمی استعداد کو اس میں کوئی اہمیت ہی نہیں ہے بلکہ کثرت جو طے کر دے وہی معیار مقبولیت اور لیاقت ٹھہرایا جاتا ہے۔ سو آدمیوں میں ننانوے آدمی جس کو منتخب کر لیں وہی حاکم بن جاتا ہے مگر ایک آدمی جو اس کے انتخاب میں شریک نہیں ہے وہ بہر حال ان کے فیصلے میں شریک نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اس ایک شخص کی رائے ان ننانوے آدمیوں سے زیادہ وزنی اور مدلّل ہو، لیکن اس کی رائے کثرت سے ٹھکرا دی جاتی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اس بات کو اپنی فارسی شاعری میں ایک شعر میں کہا ہے کہ دو سو گدھوں کے مغز کو جمع کر دینے سے فکرِ انسانی نہیں پیدا

کی جاسکتی، اس طرح کے طرزِ حکومت سے گریز بہتر ہے:

گریز از طرزِ جمہوری، غلام پختہ کارِ شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

اقبالؔ نے ملکی اور غیر ملکی حکومتوں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا اور یہ محسوس کرلیا تھا کہ جمہوری اندازِ حکومت میں نااہلوں کا منتخب ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے اس لیے کہ اخلاقی اور علمی معیار رو بہ انحطاط ہوتے جارہے ہیں۔ لہٰذا جمہوریت نظامِ زندگی نہ بن کر حکومت بنتی جارہی ہے اور ہر حکومت ''آمریت'' کے بطن سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں پرورش پاتی رہتی ہے ''خضرِ راہ'' میں اقبالؔ نے فرمایا ہے کہ:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِّ مغرب میں مزے میٹھے نشہ خواب آوری

Prof. SHARIB RUDAULVI
COLLECTION

گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

علامہ اقبالؔ نے ہمیشہ جمہوری نظامِ حیات کو پسند کیا ہے اور نظامِ حکومت کو مسترد کرتے رہے ہیں۔ جمہوری طرزِ حکومت میں بھی ملوکیت سرمایہ داری، آمریت اور سفاکیت کی جلوہ فرمائیاں، تھوڑے دوسرے انداز معیار اور میزان میں نظر آتی ہیں، اپنی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں فرماتے ہیں:

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

اس سوال کے بعد دوسرے مشیر کا جواب:

ہوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر!
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر سلطاں، پر نہیں ہے منحصر

مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرا روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

اقبالؔ انسان دوستی، برادرانہ ہمدردی اور مساوات کے حامی ہیں۔ حکمرانی اور اندازِ جہاں بانی کے منکر ہیں۔ وہ جمہوریت کے انتخابی انداز اور معیار سے باخبر ہیں۔ ہر سماج اپنے جیسا نمائندہ منتخب کرتا ہے آج جس کے سر پر عوام تاجِ اقتدار رکھ دیتے ہیں تو کل تخت و تاج چھین کر سرِ بازار رسوا کرتے ہیں۔ جب سماج کا شعور ناپختہ ہوگا تو اس کا منتخب کردہ راہبر بھی ناپختہ ہوگا، اس لیے اقبالؔ اس نمائندگی اور ترجمانی میں یقین رکھتے ہیں جو مامور من اللہ اور منصوص من اللہ ہو۔ نہ تو خداوند بزرگ و برتر جمہور کی رائے سے منتخب ہوتا ہے اور نہ نبی و رسولؑ عوام کے مشوروں اور انتخاب سے راہبر اور راہنما بنائے جاتے ہیں۔ نہ اسلامی شعار اور اصول پنچایت کے ذریعہ طے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ جیسے پنچ ہوں گے، ویسے ہی پنچایت ہوگی۔ اسلامی اخوت و مساوات کے زرّیں اصول ہادیانِ دین کے وضع کردہ اور پیش کردہ ہیں اور علامہ اقبالؔ اسی اسلامی جمہوری نظام حیات کے پیرو ہیں۔ جہاں آقا اور غلام میں کوئی فرق نہیں۔

———☆———

ALLAMA IQBAL KI ASAS-E-FIKR

By Prof. Syed Fazle Imam